علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
رفیق اعزازی

دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

بسم الله الرحمن الرحيم

علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سلسلہ مطبوعات دارالمصنّفین نمبر

- نام کتاب : علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں
- مرتب : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
- طبع اول : جون ۲۰۱۹ء
- ناشر : دارالمصنّفین اعظم گڑھ
- کمپوزنگ : صلاح الدین نثار معروفی
- صفحات : ۹۶
- قیمت : **Rs: /-**
- باہتمام : ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی

ISBN:

ALLAMA SHIBLI KI TAZIATI TAHRIREIN
Dr. Mohmmad Ilyas Azmi

Darul Mosannefin Shibli Academy
Post Box No:19, Shibli Road Azamgarh 276001
e-mail: shibliacademy@ridiffmail.com
www.shibliacademy.ong

انتساب

خلف شبلی حامد حسن نعمانی کے نواسے

ڈاکٹر سلمان سلطان

(رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنّفین)

کی نذر

تصویر علامہ شبلی

ترتیب

پیش لفظ

اہل علم کے علمی اور فکری ورثہ سے استفادہ اوران کے مطالعہ وتجزیہ کے لیے ایک بنیادی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ ان کی تصنیفات کے علاوہ ان کے بکھرے ہوئے علمی آثار مرتب اور مدون شکل میں دستیاب ہوں۔ عام قارئین ہی نہیں بلکہ محققین کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ رسائل، مجلّات اور دوسرے مآخذ میں بکھرے ہوئے آثار و باقیات تک رسائی حاصل کر سکیں۔ یہ علمی دنیا کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ علامہ شبلی کے علمی آثار کو تلمیذ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی نے بڑے تفحص اور دیدہ ریزی سے جمع اور مدون کر کے شائع کر دیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ علامہ کے علمی آثار کی دریافت کا سلسلہ جاری رہا اور کسی نہ کسی انداز میں ان کی اشاعت کا کام بھی جاری رہا۔ گزشتہ چند برسوں میں اس موضوع پر سب سے زیادہ کام ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب نے انجام دیا ہے اوران کی دلچسپی، جستجو اور کاوش سے علامہ شبلی کے آثار اور باقیات کا ایک بڑا ذخیرہ منظر عام پر آ گیا ہے اور اب علمی دنیا کو استفادہ، مطالعہ، تحقیق و تجزیہ کے لیے دستیاب ہے۔

علامہ شبلی نے بہت سی شخصیات کے انتقال پر وفیاتی اور تعزیتی تحریریں بھی لکھی ہیں جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، الندوہ، مکاتیب اوران کی دوسری نگارشات میں بکھری ہوئی ہیں۔ عام طور پر یہ مختصر تحریریں ہیں جو فوری تاثر کے زیر اثر لکھی گئیں لیکن نہایت مؤثر ہیں۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی تحریر انہوں نے ایڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو جنرل عظیم

الدین خاں پر اپنے مرثیہ کے ساتھ ارسال کی تھی۔ یہ تحریر گزٹ کے ۱۸راپریل ۱۸۹۱ء کے شمارہ میں چھپی تھی۔ جن شخصیات پر انہوں نے یہ وفیاتی تحریریں لکھیں ان میں بڑے بڑے اساطین شامل ہیں۔ اگرچہ یہ تحریریں بہت مختصر ہیں لیکن علامہ کے معجز بیان قلم سے نکلی ہیں اس لیے ان کی اہمیت اور افادیت مسلم ہے۔

ہم ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ان بکھرے ہوئے شہ پاروں کو بڑے تفحص اور محنت سے جمع کیا اور ان پر مفید حواشی کا اضافہ کیا اور اس طرح ان بکھری ہوئی تحریروں سے استفادہ کی راہ ہموار کی۔ ہم نہایت خوشی سے اس مجموعہ کو دلدادگان شبلی کی خدمت میں نذر کرتے ہیں۔

اشتیاق احمد ظلی

۱۴رجون ۲۰۱۹ء

دیباچہ

مشہور نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ [۱۹۰۶-۱۹۸۶ء] نے علامہ شبلی کی نثر اور ان کے اسلوب کی متعدد خصوصیات بیان کی ہیں اور اس کی نمایاں صفت جوش بیان، احساس کمال اور احساس عظمت قرار دیا ہے۔ ان کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ شبلی ہیرو پرست تھے۔ جاہ و جلال انھیں بہت عزیز تھا، مگر المامون میں جہاں امین کے قتل کا ذکر ہے اس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ بجائے مامون کے امین سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہے۔ قاتل کے لئے نہیں ہمیشہ مقتول ہی کے لئے ہمدردی کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی شخص کو علامہ شبلی کی حزنیہ نثر نے متاثر کیا، تاہم آج تک اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔

علامہ شبلی کی سوانحی کتب کے بعض حصوں میں حزنیہ تحریریں تو ہیں ہی البتہ اس کے زیادہ واضح نقوش موازنہ انیس و دبیر میں ملتے ہیں، جہاں انھوں نے مراثی انیس و دبیر کی تشریحات کی ہیں۔ انھیں کے مطالعہ سے خیال پیدا ہوا کہ اس کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے۔ چنانچہ میں نے علامہ شبلی کی تمام حزنیہ اور تعزیتی تحریریں تلاش کر کے پڑھیں اور ان پر جابجا حواشی اور نوٹ لکھے، پھر انھیں یکجا کرنے کا خیال پیدا ہوا تو کتابوں کے اقتباسات چھوڑ کر محض شخصیات کے حوالہ سے جو تحریریں تھیں انھیں یکجا کیا۔ اس میں ایک استثنیٰ ہے اور وہ ہے علامہ شبلی کے حادثہ پا پر ان کی تحریر جو مکتوب کی شکل میں شائع ہوئی ہے۔

پیش نظر کتاب دراصل علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی وفیاتی اور تعزیتی تحریروں کا مجموعہ ہے، جنھیں ماہنامہ الندوہ لکھنؤ [۱۹۰۴-۱۹۱۲ء] اور مکاتیب شبلی [حصہ اول ودوم] اور مکتوبات شبلی سے یکجا کیا گیا۔ ایک تحریر خطبات شبلی سے بھی نقل کی گئی ہے۔ دو وفیاتی تذکرے مکاتیب شبلی کے مختلف اقتباسات پر مبنی ہیں، جن کے حوالے دے دیئے گئے ہیں۔

علامہ شبلی نے وفیات لکھنے کا اہتمام نہیں کیا بلکہ فوری جذبات سے چند سطریں قلم برداشتہ لکھ دیں جو ماہنامہ الندوہ میں شائع ہوئیں۔ البتہ اپنے استاد مولانا فاروق چریا کوٹی [۱۸۳۴-۱۹۱۱ء] نواب محسن الملک [۱۸۳۷-۱۹۰۷ء] اور نواب میر محبوب علی خاں [۱۸۶۶-۱۹۱۱ء] نظام حیدرآباد دکن وغیرہ کی وفیات جن کی ذات سے انہیں دلی لگاؤ تھا، کسی قدر جی لگا کر لکھی ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اپنے بعض بزرگوں اور خانوادہ شبلی کے حادثات پر جو غم انگیز خطوط لکھے وہ ان کی حزنیہ تحریروں کا ایک عمدہ نمونہ ہیں۔ خاص طور پر ابتدائی دور کے شاگرد اور عزیز مولوی محمد سمیع کی والدہ کی وفات پر ان کا خط بڑا دلدوز ہے۔

اس مجموعہ میں جن اشخاص سے متعلق تعزیتی تحریریں شامل ہیں، ان میں اساطین اردو سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] مولوی محمد حسین آزاد [۱۸۳۰-۱۹۱۰ء] منشی ذکاء اللہ دہلوی [۱۸۳۲-۱۹۱۰ء] کے علاوہ برادران شبلی مہدی حسن بیرسٹر [م: ۲۹/جون ۱۸۹۷ء] اور محمد اسحاق وکیل [م: ۵/اگست ۱۹۱۴ء] علامہ شبلی کے بعض احباب اور ندوہ کے چند محسنین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کتاب میں چھوٹی بڑی کل ۲۶ تعزیتی تحریریں یکجا ہوگئی ہیں۔

یہ تحریریں فوری جذبات کا نتیجہ ہیں۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ اس میں کسی قسم کی معلومات نہیں ملتیں۔ حتی کہ ولادت ووفات کی تاریخیں بھی درج نہیں کی گئی ہیں، البتہ شخصیت کی بنیادی حیثیت کا ذکر آ گیا ہے۔

علامہ شبلی کی ان تحریروں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا انداز نگارش ہے۔ وہ حزنیہ اور غمناک الفاظ سے درد واثر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تحریر کی پوری فضا غم ناک

ہوجاتی ہے۔بعض تحریریں تو حزنیہ نثر کا شہ پارہ ہیں۔خاص طور پر جب وہ کسی کی والدہ کی وفات پر تعزیت کرتے ہیں تو ان کے سامنے خود ان کی والدہ (قائمہ بی بی) کا سراپا آجاتا ہے اور ان کا قلم شدت غم سے بے قابو ہونے لگتا ہے۔چونکہ علامہ شبلی کے اس پہلو پر اب تک نظر نہیں کی گئی تھی، اس لئے ان تحریروں کو جمع کیا گیا ہے۔بلا شبہ یہ بھی قدر دانان شبلی کے لئے دلچسپی کی چیز ہے۔

یہ تحریریں کتاب میں زمانی اور تاریخی ترتیب کے مطابق شامل کی گئی ہیں۔البتہ افادیت کے پیش نظر تعلیقات وحواشی کا اہتمام کیا گیا ہے۔خاص طور پر شخصیات کے اجمالی تذکرہ اوران کے سنہ ولادت ووفات کی تحقیق وتعیین میں عرق ریزی کی گئی ہے۔تذکرہ لکھنے میں علامہ شبلی سے ان کے مراسم وتعلقات کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔خوشی ہے کہ اس میں شبلیات کے حوالہ سے چند ایک نئے پہلو بھی آگئے ہیں۔کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ علامہ شبلی کی عیادت کے لئے نواب محسن الملک اعظم گڑھ تشریف لائے اور تین دن شبلی منزل میں قیام کیا اور نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کے طلبہ نے انھیں سپاس نامہ پیش کیا۔اسی طرح مولوی ریاض حسن خاں خیال رئیس رسول پور بھی حادثہ پا کے موقع پر اعظم گڑھ تشریف لائے تھے۔علامہ شبلی کے حوالہ سے بعض دوسری نئی معلومات بھی حواشی میں آگئی ہیں۔

اس میں چند ایسے اشخاص پر بھی تعزیتی تحریریں شامل ہیں جن کے علامہ شبلی نے مرثیے بھی کہے ہیں۔موضوع کی مناسبت سے وہ مراثی بھی شامل کر دیئے گئے۔اردو مرثیہ جو انھوں نے اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ کی نا گہانی موت پر کہا تھا، جو درد واثر کا نمونہ ہے۔پروفیسر کلیم الدین احمد نے اسے علامہ شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا ہے۔اور عبداللطیف اعظمی نے تو مرزا غالب کے مرثیہ سے موازنہ کر کے اس کی برتری ثابت کی ہے۔

مختلف انداز کی علامہ کی ان تعزیتی تحریروں سے معاصرین اور متعلقین کے بارے میں علامہ شبلی کے نقطۂ نظر کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔اس کی بیشتر تحریریں ایسی

ہیں جو اب تک علامہ شبلی پر لکھنے والوں کے پیش نظر کم ہی رہی ہیں۔ خاص طور پر الندوہ کی وفیات کا حوالہ کسی تحریر میں میری نظر سے آج تک نہیں گذرا۔

علامہ شبلی اپنے بھائی مسٹر مہدی حسن بیرسٹرایٹ لا سے ان کی آزادانہ روش کی وجہ سے ناراض ہوتے تھے جس کی بنیاد پر شیخ محمد اکرام نے یادگار شبلی میں ایک داستان گھڑ دی ہے۔ گو ڈاکٹر ابن فرید نے اس کی تردید کر دی ہے تاہم اس مجموعہ میں شامل ایک تحریر سے اس کی خود بخود تردید ہو جاتی ہے۔

عبدالغفار اور قاضی محمد سلیم سے متعلق علامہ شبلی کے جو تعزیتی خطوط شامل کئے گئے ہیں، ان سے دونوں سے علامہ کے بے حد گہرے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے، مگر تلاش بسیار کے باوجود ان دونوں بزرگوں کے بارے میں کسی قسم کی تفصیلات نہ مل سکیں اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ یہ کون لوگ تھے اور کہاں کے رہنے والے تھے۔ ان کے علاوہ چند اور پہلو بھی تشنہ تحقیق ہیں، ممکن ہے آئندہ کسی اہل نظر کی توجہ سے ان کی وضاحت ہو جائے۔

آخر میں افادیت کے پیش نظر اشخاص اور کتب و مقامات کا اشاریہ بھی شامل کیا ہے اور کتابیات بھی دی گئی ہے۔

میرے دیگر علمی کاموں کی طرح اس کام میں بھی دارالمصنّفین کے فعال ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب کی رہبری اور رہنمائی شامل حال رہی ہے۔ ان کے مفید اور قیمتی مشوروں کی بدولت اس کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ شفقت تادیر قائم رکھے۔

محمد الیاس الاعظمی
رفیق اعزازی دارالمصنّفین اعظم گڑھ

۶/ جون ۲۰۱۹ء

علامہ شبلی پر ایک نظر

علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ ۴؍جون ۱۸۵۷ء کو موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ کے نامور وکیل اور شعر و ادب کے بڑے اداشناس تھے۔ رفاہ عام کے کاموں میں بھی آگے بڑھ کر حصہ لیتے۔ تصوف کے بھی ذوق آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے بچوں کے نام شبلی وجنید رکھے اور علم دین کی تعلیم دلائی۔ علامہ شبلی ان کے بڑے بیٹے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر مولوی عبداللہ جیراج پوری سے تحصیل علم کیا۔ اس کے بعد مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں داخل ہوئے۔ اسی زمانہ میں ان کے والد نے اعظم گڈھ شہر میں مدرسہ عربیہ قائم کیا تو وہ اس میں آگئے۔ بعدازاں شیخ حبیب اللہ نے مولانا فاروق چریاکوٹی کو مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ میں استاذ مقرر کیا۔ چنانچہ اسی مدرسہ میں انھوں نے تعلیم کی تکمیل کی۔ پھر مختلف علوم وفنون میں مہارت پیدا کرنے کے لئے مثلاً فقہ کی تحصیل کے لئے مولانا ارشاد حسین رام پوری، ادب کے لئے مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور حدیث کے لئے مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اسی زمانہ میں ان کے والد اور خانوادے کے دیگر افراد حج کے لئے جارہے تھے، چنانچہ انھوں بھی رخت سفر باندھا اور تعلیم کے بعد سب سے پہلے اللہ کے گھر کی زیارت کی۔ وہاں بھی ان کا ذوقِ علم ومطالعہ غالب رہا اور انھوں نے مدینہ منورہ کی کتب خانوں سے استفادہ کیا۔

حج بیت اللہ کے بعد اعظم گڈھ میں مختلف مشاغل اختیار کئے ۔ کچھ دن امین رہے ۔ پھر والد کی خواہش اور مرضی کے مطابق وکالت کا امتحان پاس کر کے اعظم گڈھ اور بستی میں وکالت کی، لیکن ان سب کاموں میں ان کا جی لگا اور نہ کامیاب ہوئے ۔

ان کے والد شیخ حبیب اللہ سرسید اور علی گڈھ تحریک کے ابتدائی ہم نواؤں میں تھے ۔ سرسید نے اعظم گڈھ کا سفر کیا تو وہ ان کے ساتھ رہے ۔ کالج کی مالی معاونت کی ۔ بعض عمارتوں کی تعمیر میں بھی انھوں نے حصہ لیا ۔ سرسید نے پٹریاٹک سوسائٹی قائم کی تو انھیں اعظم گڈھ کا کرسپانڈنگ رکن نامزد کیا ۔ اسی تعلق کی بنا پر انھوں نے اپنے بچوں، بھتیجوں اور قرب وجوار کے طلبہ کو علی گڈھ میں داخل کرایا ۔ ان کے دوسرے بیٹے مہدی حسن جو حفظ قرآن مکمل کر چکے تھے انھیں انگریزی تعلیم دلائی اور علی گڑھ بھیجا ۔ وہ علی گڈھ کے ابتدائی طلبہ میں سے تھے ۔ چنانچہ علی گڑھ سے ایف اے کرنے کے بعد وہ بیرسٹری کے لئے لندن گئے اور بیرسٹر ہوئے ۔ منجھلے بیٹے محمد اسحاق نے بھی علی گڑھ سے بی اے کیا اور وکالت پاس کر کے الہ آباد کے نامور وکیل ہوئے ۔ ۱۸۸۲ء میں شیخ صاحب بچوں سے ملنے علی گڈھ گئے تو علامہ شبلی کو بھی ساتھ لے گئے ۔ اس دور میں علامہ شبلی کے دل میں سرسید کا کتنا احترام رہا ہوگا کہ وہ علی گڑھ آئے تو خالی ہاتھ نہیں آئے، سرسید کی مدح میں عربی میں قصیدہ کہہ کر ساتھ لائے اور پیش کیا ۔ جسے سرسید نے بہت پسند کیا اور شیخ صاحب کی آمد، کالج کے معائنہ اور اس قصیدہ کا ذکر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں کیا اور قصیدہ کو بھی شائع کیا ۔ اس قصیدہ میں شبلی نے سرسید کے لئے جن جذبات کا اظہار کیا ہے اور جیسا ان کا سراپا کھینچا ہے وہ بے حد اہمیت رکھتا ہے ۔ خاص طور پر اس پس منظر میں کہ اس وقت تک علامہ شبلی جدید دنیا سے ناواقف تھے ۔ بہر حال علامہ شبلی کی سرسید سے یہ پہلی ملاقات تھی ۔

علی گڑھ جانے سے پہلے اعظم گڑھ میں علامہ شبلی کی مشغولیات متنوع تھیں ۔ وہ کبھی شعر وشاعری کی محفل سجاتے ہیں، کبھی طلبہ کو درس دیتے ۔ شدید حنفیت کے زیر اثر اہل

حدیث علماء سے مناظرے کرتے ہیں ۔ان کے خلاف رسالے لکھتے۔ ان کی ابتدائی تصنیفات اسکات المعتدی اور رسالہ ظل الغمام اسی مناظرانہ شغل کی یادگاریں ہیں۔

کتب بینی اور مطالعہ کا شوق انھیں بچپن سے تھا۔اعظم گڑھ کے کتب فروشوں کی دکانوں پر کھڑے ہوکر وہ کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھےاوراپنے احباب سے کتابیں حاصل کر کے ان کا مطالعہ کرتے ۔غرض علم ومطالعہ کے وہ بڑے شائق تھے،مگراس وقت تک ان کی فکرونظر کا میدان حنفیت کی تبلیغ واشاعت تھا۔

۱۹۸۳ء میں علی گڑھ کالج میں فارسی کی جگہ نکلی تو وہ اپنے استاذ مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے سفارشی خط کے ساتھ اس کے امیدوار ہوئے ۔چنانچہ ان کا انٹرویو اس طرح ہوا کہ سرسید کے کتب خانہ میں انھیں بلایا گیا، وہ آئے تو کتابیں دیکھ کر جوالماریوں میں بند تھیں الماریوں کا چکر لگاتے رہے۔ان سے کہا گیا کہ اب انٹرویوکل ہوگا۔دوسرے دن آئے تو الماریاں کھلی ہوئی تھیں ،چنانچہ وہ الماریوں سے کتابیں نکال نکال کر دیکھتے رہے۔ پھران سے کہا گیا کہ اب انٹرویوکل ہوگا۔تیسرے دن وہ آئے تو کتب خانہ میں کرسی اورمیز بھی موجود تھی ۔ چنانچہ وہ الماریوں سے کتابیں نکال کرمطالعہ میں منہمک ہوگئے ۔اسی اثناء میں سرسید احمد خاں تشریف لائے اوران کے ذوق مطالعہ کو دیکھ کران کے تقرر کی خوش خبری سُنائی، گویاان کے بڑھے ہوئے ذوق مطالعہ نے انھیں علی گڑھ سے وابستہ کیا اوراب انھیں بھی اندازہ ہوا کہ سرسید احمد خاں کس قدر جویائے علم اور دانائے راز تھے، چنانچہ فروری ۱۸۸۳ء میں وہ علی گڑھ کالج سے وابستہ ہوئے ۔یہاں آئے تو سرسید کے کتب خانہ، سرسید کی صحبت اور پروفیسر آرنلڈ سے تبادلۂ خیالات نے ان کے ذوق ونظر کی دنیاہی بدل دی۔اس وقت کالج نئے علوم وافکار بلکہ جدید دنیا کا ایک اہم مرکز تھا۔

ابتداء میں وہ کالج سے باہر رہتے تھے۔سرسید نے انھیں اپنے قریب بلاکرایک بنگلیہ میں قیام کرنے کا موقع دیا، جسے عرف عام میں شبلی کی بنگلیہ کہا جاتا تھا۔اس طرح ان

کا اور سرسید احمد خاں کا شب و روز کا ساتھ ہوا تو علامہ شبلی سرسید کی زبان بولنے لگے۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک کی حمایت میں انھوں نے ۱۸۸۵ء میں مثنوی صبح امید لکھی۔ اس میں انھوں نے سرسید کا جو سراپا کھینچا ہے اور علی گڈھ تحریک کی جس قدر تعریف وتوصیف کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ بڑی بڑی کتابوں سے بھی نہ ہوسکی۔

اس زمانہ میں سرسید ایجوکیشنل کانگریس قائم کر چکے تھے۔ اس کے دوسرے اجلاس میں علامہ شبلی نے شرکت کی اور سرسید کی خواہش پر ''مسلمانوں کی گذشتۂ تعلیم'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ لکھنؤ کی شاہی بارہ دری میں سرسید احمد خاں کی موجودگی میں پیش کیا گیا۔ جب یہ مقالہ پیش کیا جارہا تھا اس وقت کے امراء اور روؤسا و والیانِ ریاست اور جدید علوم وفنون کے شیدائی موجود تھے اور لوگ اُٹھ اُٹھ کر پوچھتے تھے کیا مولانا ہمارا ماضی ایسا ہی شاندار تھا، جیسا کہ آپ بیان کر رہے ہیں۔؟ علامہ شبلی نے اس مقالہ میں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، قدیم مدارس، دارالعلوم اور اس کی ترقیوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ سرسید نے اس رسالہ کو بے حد پسند کیا اور مدرسۃ العلوم کی طرف سے شائع کیا۔

یہاں آ کر علامہ شبلی کے خیالات اور غور فکر کا محور بدل گیا اور انھیں معلوم ہوا کہ اسلام اور شعائرِ اسلام پر اغیار کے کس قسم کے اعتراضات ہیں اور اسلام کی سچی خدمت کا میدان کیا ہے۔ یہیں وہ سرسید کی صحبت اور پروفیسر آرنلڈ کی رفاقت میں مستشرقین سے اور ان کے اسلام پر اعتراضات سے واقف ہوئے اور یہیں وہ جدید تحقیق کے اصول وآداب سے بھی واقف ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے رسالہ کتب خانہ اسکندریہ لکھا، جس میں انھوں نے مسلمانوں پر عائد اس الزام کا کہ کتب خانہ اسکندریہ مسلمانوں نے برباد کیا اور مسلمان علم کے دشمن تھے، بڑا مدلل جواب لکھا اور ثابت کیا کہ مسلمانوں پر یہ محض الزام ہے۔ حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں اور کتب خانہ اسکندریہ خود عیسائیوں نے جلایا اور اس کے جلانے میں ان کے مذہبی پیشوا شریک تھے۔ اس محققانہ مقالہ نے اہل علم کو بے حد متاثر کیا

اوراس سے مغربی اہل قلم کے نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ الجزیہ اور حقوق الذمیین بھی ان کے اسی نوع کی تحقیقات کے نمونے ہیں۔ الجزیہ کا سرسید نے انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع کیا۔ الجزیہ کے بارے میں انھوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر مولانا شبلی مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہیں کہ ''فأتوا بسُورةٍ مِن مِثلِهٖ'' تو کچھ تعجب نہ ہوگا۔

ایم اے او کالج علی گڑھ کی فضا میں انھوں نے درس و تدریس کے ساتھ شعر و سخن کا بھی سلسلہ جاری رکھا۔ کالج کی خاص خاص مجالس میں وہ شریک ہوتے، قصائد پیش کرتے، خاص طور پر کالج میں کوئی مہمان آتا تو اس کے منظوم استقبال اور قصائد پیش کر کے کالج کی ادبی فضا اور اس کے وقار میں اضافہ کرتے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک وہ کالج سے وابستہ رہے۔ ان میں بیشتر تخلیقات کو سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا۔

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، جو ان کے جدید دور تصنیف اور تحقیق کی پہلی کاوش ہے کے بعد ۱۸۸۷ء میں خلیفہ مامون کی سوانح اور تاریخ المامون لکھی۔ ان کی یہ تصنیف بھی بے حد مقبول ہوئی اور کالج کی طرف سے شائع ہوئی۔ ۱۸۸۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن سرسید کے گراں قدر دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا۔ اس میں سرسید نے اپنے سے چالیس سال چھوٹے علامہ شبلی کی جس قدر تعریف و تحسین کی ہے وہ مثالی ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کس درجہ بلند رتبہ شخص تھے۔ انھوں نے علامہ شبلی کے مورخانہ حیثیت کی داد دی، ان کے وسعت مطالعہ کو سراہا۔ خاص طور پر حوالہ اور مآخذ کے اہتمام کی تحسین و ستائش کی اور شبلی کے اسلوب نگارش کی ایسی تعریف کی کہ اس سے پہلے کسی نے نہ کی ہوگی۔ انھوں نے لکھا کہ المامون کی زبان ایسی ہے کہ دلی والوں کو بھی رشک آتا ہوگا۔ اس کے بعد شبلی نے سیرۃ النعمان لکھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن بھی کالج کی طرف سے شائع ہوا۔ اس میں امام اعظم کے حالات و سوانح کے ساتھ فقہ اور اس کی جزئیات پر ایسی بحثیں کیں اور ایسا تجزیہ پیش کیا کہ اس سے پہلے اردو میں اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ ان کی یہ تحقیقات جہاں صحبت سرسید کے

زیر اثر پیدا ہونے والے جدید ذہن کا پتہ دیتی ہیں، وہیں شبلی کے گہرے مطالعہ اور روایتی مذہبی تحقیقات کے گہرے مطالعہ ومشاہدہ سے بھی واقف کراتی ہیں۔

اس کے بعد ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے طلبہ میں سیرت نبوی سے شیفتگی پیدا کرنے کے لئے رسالہ بدُ الاسلام تیار کیا جو عرصہ تک کالج کے نصاب میں شامل رہا۔

علامہ شبلی نے کالج میں میلاد کی مجلسیں منعقد کرنے کی طرح کی ڈالی۔ چنانچہ سیرت نبوی کے جلسے جس میں وہ خود سیرت پر تقریریں کرتے، ہر سال ہونے لگے۔ پھر اس قدر اہتمام ہوا کہ یہ جلسے سالار منزل اور اسٹریچی ہال میں منعقد ہونے لگے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ انگریز پرنسپل اور انگریز اساتذہ کے درمیان علامہ شبلی کی یہ کوششیں کس درجہ اہم رہی ہوگی۔ دراصل یہ ان کی مذہبی روح اور مذہب سے حد درجہ لگاؤ کا نتیجہ تھا۔ واقعہ یہ کہ انھوں نے اپنے عالمانہ وقار اور وجاہت کا ہمیشہ خیال رکھا۔

سرسید نے کالج کے تعاون کے لئے ایک تھیٹر قائم کیا، جس میں سرسید تحریک کے بعض اہم رہنما شریک ہوکر اپنے اپنے کردار ادا کئے۔ اس کا ایک کردار علامہ شبلی بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ترکیب بند پیش کیا کہ اسے آج بھی پڑھنے سے حرارت پیدا ہوجاتی ہے۔

سیرۃ النعمان کے بعد انھوں نے الفاروق کی تصنیف کا آغاز کیا اور علی گڑھ میں کیا۔ سرسید کالج میں شیعہ سنی تفرقہ کے خوف سے الفاروق کی تصنیف کے حق میں نہ تھے، باوجود اس کے علامہ شبلی نے اسے لکھا۔ یہ دراصل علامہ شبلی کا ذوقی معاملہ تھا۔ یہ کتاب سرسید کی وفات کے بعد ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی، مگر سبقت کی غرض سے جب مولوی سراج الدین نے سیرۃ الفاروق لکھی تو سرسید نے ان سے ناراضی ظاہر کی اور لکھا کہ اگرچہ ہم اس کے حق میں نہیں ہیں، مگر مولوی سراج الدین کا سبقت کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہئے کہ مولوی شبلی کیا لکھتے ہیں اور اسی میں انھوں نے علامہ شبلی کی بھی تسلی کی کہ اس سبقت سے کیا اگر دس لوگ بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر ان سب میں نرالی ہوگی۔

۱۸۹۲ء میں شبلی نے روم ومصر وشام کا سفر اختیار کیا۔ نہ صرف علی گڑھ کالج کی تاریخ میں بلکہ ہندوستان کے تمام کالجوں کی تاریخ میں علامہ شبلی پہلے ایسے پروفیسر تھے، جنہوں نے بیرون ملک کا تعلیمی سفر کیا۔ اس سفر کے کئی مقاصد تھے۔ اسلامی تاریخ کی باقیات کا مطالعہ ومشاہدہ۔ اسلامی ممالک کے طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم کا مطالعہ وجائزہ۔ الفاروق جس کی تصنیف کے لئے ہندوستان کے کتب خانے ناکافی تھے اس کا مواد حاصل کرنا وغیرہ۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اس سفر میں ان تمام اموراور مقاصد پر گہری نظر رکھی۔ قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس اور خاص طور پر مصر کے مدارس اور کالجوں کا معائنہ کیا۔ جامع از ہر دیکھا۔ قدیم وجدید تعلیم کے تقریباً تمام اداروں کے معائنہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ وہاں بھی طریقۂ تعلیم صحیح نہج پر قائم نہیں ہے۔ انھوں نے جامع از ہر پر بھی اظہار افسوس کیا اور سرسید کو لکھا کہ یہاں بھی جدید وقدیم تعلیم علاحدہ علاحدہ ہے اور جب تک اس کے ڈانڈے نہ ملیں گے اصل ترقی مفقود رہے گی۔

اس سفر میں انھوں نے بے شمار کتب خانوں کی سیر کی۔ نادر وکمیاب کتابوں کا مطالعہ کیا۔ نوٹس لئے اور نقل نویسوں سے کتابیں نقل کرائیں، قسطنطنیہ میں کتب خانوں کی سیر پا پیادہ کی۔ یہ تمام تفصیلات سفر نامہ روم ومصر وشام اور سرسید کے نام خطوط میں موجود ہیں۔

اس سفر میں انھیں عالم اسلام کی نامور شخصیات سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ اوران کے افکار سے بھی واقف ہوئے۔ غازی عثمان پاشا جنھوں نے جنگ روم وروس میں روسیوں کے چھکّے چُھڑا دئے تھے، ان سے بھی ملاقات کی۔ ترکی میں مسلمانوں کے خلیفہ سلطان عبدالحمید سے ملاقات کی اور انھوں نے تمغہ مجیدیہ سے سرفراز کیا۔ غرض وہ لوٹے تو ان کے ساتھ بہت کچھ تھا، مگر یہ انگریزی حکومت کی پالیسی اور نقطۂ نظر کے خلاف تھا۔ انگریز سلطان عبدالحمید کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ شبلی کو پین اسلامزم کا ہندوستان میں نمائندہ خیال کیا گیا اور سخت ناراضگی ظاہر کی گئی، سرسید نے معاملہ

سلجھایا اور حکومت وقت سے کہا کہ کالج میں ایک ایسا شخص موجود ہے جسے ترکی حکومت تو تمغۂ مجیدیہ عطا کرتی ہے اور ہماری حکومت محض ناراضی۔ چنانچہ سرسید احمد خاں کی کوششوں سے ۱۸۹۴ء میں علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملا، مگر ساتھ ہی تمغۂ مجیدیہ کے استعمال پر پابندی بھی عائد کردی گئی بلکہ ان پر خفیہ پولس بھی لگادی گئی۔

علامہ شبلی کی صحت کو علی گڑھ کی آب وہوا کبھی راس نہیں آئی اور ان کی صحت اکثر خراب رہی، اس لئے وہ کالج سے علاحدہ ہونا چاہتے تھے۔ پرنسپل مسٹر بیک نے سرسید سے خواہش کی کہ انھیں چھ ماہ کی رُخصت دی جائے تا کہ وہ چھ ماہ کالج میں رہ کر تعلیم وتدریس کا کام کریں اور چھ ماہ کہیں اور قیام کر کے تصنیف وتالیف کا کام کریں۔ گو سید محمود (۱۸۵۰-۱۹۰۳ء) نے اس کی مخالفت کی، مگر سرسید نے ان کی یہ تجویز منظور کر لی۔ ابھی اس پر عمل بھی نہیں ہو پایا تھا کہ سرسید نے ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔ علامہ شبلی کو اس کا بڑا صدمہ پہونچا اور انھوں نے علی گڑھ کی ملازمت سے اسی سال استعفا دیدیا۔

علامہ شبلی علی گڑھ کالج سے (۱۸۸۳-۱۸۹۸ء) سولہ سال وابستہ رہے۔ درس و تدریس کا فریضہ اس طرح انجام دیا کہ طلبہ میں عربی وفارسی کا صحیح مذاق پیدا کردیا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، بابائے اردو مولوی عبدالحق، خوشی محمد ناظر، سید سجاد حیدر یلدرم، مولوی مسعود علی محوی اور بہت سے ایسے نام ہیں جن کا مذاق شعر وادب اور علم وادب سے گہرا لگاؤ اور تحقیق وتدقیق کا چسکہ انھیں کا پیدا کردہ ہے۔ مولانا جوہر تو آخر تک کہتے رہے کہ میرا ذوق قرآن استاد شبلی کی دین ہے۔ یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ علی گڑھ کالج میں تعلیم کے آغاز سے پہلے وہ درس قرآن دیتے، جس میں تمام طلبہ شریک ہوتے اور یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔ پہلے سیرت کے جلسے اور پھر درس قرآن کے ذریعہ علامہ شبلی نے علی گڑھ میں مذہبی فضا قائم کی۔ اس دور کے متعدد طلبہ نے اس سے اپنے شغف کا ذکر کیا ہے۔

علامہ شبلی علی گڑھ میں سرسید کے ساتھ رہے۔ ان کی صحبتوں میں شریک رہے۔

ان سے بہت کچھ سیکھا، مگر ان کے بعض نظریات سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر بعض مذہبی اور سیاسی معاملات میں ان کا نقطۂ نظر مختلف تھا۔ اس سے سرسید بھی واقف تھے۔ مگر انھوں نے کبھی اس پر ناراضی کا اظہار نہیں کیا اور وہ جس بلند ظرف کے شخص تھے کر بھی نہیں سکتے تھے، مگر بعد میں علی گڑھ کے بعض نام نہاد ہم نواؤں نے غیر ضروری طور پر اس اختلاف رائے کو ہوا دی اور نقطۂ نظر کے اختلاف کو ذاتی اختلاف بلکہ عناد ثابت کر کے دوریاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ غور وفکر کرنے والے ذہنوں اور دماغوں میں اختلاف ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ زمانہ کی رفتار اور نئی ضرورتوں کے تقاضوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ سرسید احمد خاں نے ۱۸۵۷ء کے سانحات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ علامہ شبلی سرسید کے بعد کی نسل سے تھے۔ انہوں نے اپنے دور کے حالات کے لحاظ سے سیاسی معاملات میں ایک نیا نظریہ اختیار کیا۔ ڈیڑھ سو برس بعد آج ہم جائزہ لیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیاست میں علامہ شبلی کا نظریہ زیادہ درست تھا، مگر سرسید کا قوم سے انتہائی جذباتی اور مخلصانہ معاملہ بھی کم اہمیت کا حامل نہیں تھا۔

علامہ شبلی علی گڑھ کالج کی ملازمت سے علاحدہ ہوئے، علی گڈھ سے کبھی علاحدہ نہ ہوئے۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کالج میں قیام کے خواہاں رہے۔ ۱۹۰۴ء میں ان کے دوست محسن الملک نے انھیں کالج سے دوبارہ وابستہ ہونے کے لئے راضی بھی کر لیا تھا۔

وہ سرسید کے زمانہ میں اور بعد میں بھی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے۔ اس میں تقریریں کرتے، قراردادیں پیش کرتے، اختلاف واتفاق کرتے اور پورے طور پر مباحثہ میں دلجمعی سے شریک رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت سے علاحدگی کے پانچ سال بعد انھیں ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے ایک شعبہ انجمن ترقی اردو کا سکریٹری نامزد کیا۔ جس پر وہ تقریباً تین برس تک فائز رہے۔ چنانچہ ترقی اردو کے متعدد

منصوبے بنائے۔اہل علم اورادباءوشعراء سے خط وکتابت کی۔اس کے حساب کتاب کانظم کیا۔ترجمہ کے لئے متعدد کتابوں کا انتخاب کیا۔ادباءکوانعامات دینے کا سلسلہ قائم کیا اور انجمن کی ماہ بہ ماہ رپورٹ لکھ کرنواب محسن الملک کو پیش کرتے رہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے علامہ شبلی ہی کی بچھائی ہوئی بساط پر انجمن میں نئے برگ وبار پیدا کئے، گوکبھی اس کااعتراف نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ناقد ہی رہے۔

ان کے آخری دور میں آغا خان کی سرکردگی میں یونیورسٹی فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا،اس کے ایک رکن علامہ شبلی بھی تھے۔لکھنؤ میں اس کے جلسوں میں شریک رہے۔ مالی تعاون میں بھی حصّہ لیااور یونیورسٹی کے لئے جووفد گورنر سے ملنے شملہ گیا تھااس میں علامہ شبلی بھی شامل تھے۔گویاعلی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کی جدجہد میں بھی شبلی کا حصہ ہے۔

علامہ شبلی اخیر تک علی گڑھ کالج آتے اورطلبہ سے خطاب کرتے رہے۔اسی کالج میں انھوں نے کہا تھا کہ یہ کالج جس طرح طلبہ کی تربیت کرتا ہے،اسی طرح اساتذہ کی بھی تربیت کرتا ہے۔طلبہ کو اگر بی اے،ایم اے کرتا ہے تو اساتذہ کوشمس العلماء بناتا ہے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ شبلی کوسرسید نےشمس العلماء کا خطاب جس وقت دلوایا،اس وقت تک ڈپٹی نذیر احمد اورمولانا حالی کوبھی شمس العلماء کا خطاب نہیں ملا تھا۔ بہرحال علامہ شبلی نے اخیر تک کالج سے تعلق رکھا۔آخری بار انھوں نے اسٹریچی ہال میں ۱۹۱۳ء میں اپنے انتقال سے چند ماہ پہلے خطاب کیا تھا،جس کی روداد انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہےاور جوخطبہ دیا تھاوہ خطبات شبلی میں شامل ہے۔

علامہ شبلی علی گڑھ میں نہ صرف سرسید کی محفلوں میں شامل رہے بلکہ ان کے ساتھ سفر بھی کیا۔سرسید کے نینی تال سفر میں بھی ساتھ رہے۔اسی طرح ۱۸۹۲ء میں وہ حیدرآباد کے سفر میں بھی سرسید کے ساتھ گئے۔وہاں کے جلسوں میں تقریریں کیں،ترکیب بند پیش کئے۔ان کی انہی علمی وتصنیفی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر نظام حیدرآباد کی طرف سے انھیں سو

روپیہ ماہوار وظیفہ ملا اور ان کی آئندہ تصنیفات کو سلسلہ آصفیہ حیدرآباد میں داخل کرنے کا حکم ہوا اور بعد کی چند تصنیفات اسی کے تحت حیدرآباد سے شائع بھی ہوئیں۔

استعفیٰ کے بعد علامہ شبلی علی گڑھ سے اعظم گڈھ آئے۔ الفاروق پایہ تکمیل تک پہنچائی اور ۱۸۹۹ء میں مطبع نامی کان پور سے شائع ہوئی۔ اسی زمانہ میں ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل بیمار ہوئے اور ۱۲/نومبر ۱۹۰۰ء کو وفات پائی۔ شیخ صاحب کی آمدنی تو بہت تھی، وکالت کے علاوہ نیل اور شکر کے گودام اور زمینداری سے بھی بہت کچھ آتا تھا، مگر وہ بڑے دریا دل اور شاہ خرچ تھے۔ رفاہ عام کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے، دوسرے بیٹے مہدی حسن کی لندن میں بیرسٹری کی تعلیم میں بھی ایک بڑی رقم خرچ ہوئی اور پھر ان کی واپسی پر شیخ صاحب نے اعظم گڈھ میں ایسی دعوت کی جو ہفتہ بھر چلتی رہی، اس لئے جب انھوں وفات پائی تو ایک بڑا قرض چھوڑا۔ جس کے ادا کرنے کی ذمہ داری علامہ شبلی کے سر آئی۔ چنانچہ انھوں نے ندوہ کے بجائے حیدرآباد کا رُخ کیا اور ۱۹۰۱ء میں ناظم سررشتہ علوم وفنون کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ حیدرآباد میں وہ چار سال اور کچھ ماہ رہے۔ اس دوران ملازمت کے فرائض کے علاوہ انجمن ترقی اردو کا بار گراں بھی اُٹھائے رہے، اس کے علاوہ انھوں نے چار اہم کتابیں لکھیں۔ الکلام، علم الکلام، سوانح مولانا روم اور الغزالی اسی قیام حیدرآباد کی یادگاریں ہیں۔ اپنے موضوع پر یہ اس قدر اہم کتابیں ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے نے کتنی محنت اور مشقت کا سامنا کیا ہوگا۔ خاص طور پر سوانح مولانا روم میں تحقیق منسوبات میں انھوں نے جو زور تحقیق صرف کیا ہے وہ بس انہیں کا حصّہ ہے۔

حیدرآباد کے اندرونی سیاسی حالات سے وہ دل برداشتہ تھے اور جب والد کا قرض بھی ادا ہو چکا تو انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور وظیفہ جاری کرنے کی درخواست دی۔ چنانچہ دونوں منظور ہوئے اور اب انھوں نے بقیہ زندگی ندوہ کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا اور لکھنؤ آگئے اور اپنی تمام تر قوت ندوہ کی تعمیر وترقی میں لگادی۔

تحریک ندوہ کے وہ اہم اور فعال لوگوں میں تھے۔اس کے اجلاسوں میں پابندی سے شریک ہوتے ،قراردادیں پیش کرتے۔تعلیم ،طرز تعلیم اور نصاب تعلیم پر بحث کرتے ،سچ تو یہ ہے کہ ہمارے قدیم علوم پر ان کی جتنی گہری نظر تھی ،شاید ہی تحریک ندوہ میں کسی اور کی رہی ہوگی۔یہی وجہ ہے کہ ندوہ کا دستور انھوں نے بنایا اور اس کے اغراض و مقاصد انھیں نے طے کئے۔دارالعلوم کا نصاب تعلیم بھی انھیں نے بنایا۔اسی سے متاثر ہو کر انھیں ۱۹۰۴ء میں معتمد تعلیم مقرر کیا گیا۔چنانچہ وہ ندوہ آئے تو اپنی تمام صلاحیتیں اس پر لگا دیں۔ تھے تو وہ معتمد تعلیم مگر ندوہ کے لئے خط و کتابت کرنا ،تعاون کے لئے سفر کرنا ،اہل ثروت اور والیان ریاست سے رابطہ کرنا،سب انھوں نے اپنے سر لے لیا اور بڑی بڑی رقمیں حاصل کیں۔ان سے پہلے ندوہ کا خزانہ خالی تھا،انھوں نے اپنی جد و جہد سے اس کی مالیات کا مسئلہ حل کر دیا۔

وہ دارالعلوم میں آجاتے تو مختلف درجات میں چلے جاتے۔خود پڑھاتے اور اساتذہ کو بھی طریقہ تدریس کے ہنر سمجھاتے۔پُرانے طرز تعلیم کے بجائے وہ جدید تعلیم یعنی لکچر کا طریقہ اختیار کرنے پر زور دیتے۔ندوہ میں انھوں نے قرآن بھی پڑھایا اور حدیث بھی،یہی نہیں انھوں نے ملک کے ممتاز علماء کو بلا کر ندوہ میں تعلیم کا معیار بلند کیا۔مولانا حمیدالدین فراہی کو اکثر بلاتے جو قرآن پر درس دیتے اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب سالانہ جلسہ ندوہ میں ہندوستان کے ممتاز علما کے ساتھ مصر سے شیخ رشید رضا ایڈیٹر المنار کو بلا کر صدارت کرائی۔اسی اجلاس میں مولانا سید سلیمان ندوی نے عربی میں ایسی برجستہ تقریر کی تھی کہ خوش ہو کر بھرے جلسے میں اپنا عمامہ ان کے سر پر رکھ دیا تھا۔یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے ندوہ کا رشتہ عالم عربی سے قائم کیا اور ندوہ کی آواز عالم عرب میں گونجی۔

ندوہ کے نصاب میں انگریزی کی شمولیت پر بڑے لیت و لعل سے کام لیا گیا اور علامہ شبلی کو دقتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا مگر بالآخر انہیں کامیابی ملی۔بعد میں تو انھوں نے ہندی اور سنسکرت تک کا شعبہ قائم کیا اور تعلیم کے لئے ان زبانوں کے ماہرین کا تقرر کیا۔

۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۳ء تک وہ ندوہ سے وابستہ رہے۔ایک گروہ نے اندرون ندوہ انھیں مسلسل اُلجھا کر رکھا۔کبھی ندوہ کے معاملات میں تنگ کرتے۔کبھی ان کی کسی کتاب کی عبارت نقل کر کے کفر ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔انھیں دارالعلوم میں علی گڑھ کے تعلق کی بنیاد پر ساقط الاعتبار قرار دیتے۔ان کے ہر کام میں رکاوٹ ڈالتے،مگر خدا جانے وہ شخص کس چیز کا بنا تھا کہ باوجود ان تمام الجھنوں کے اپنے کاموں میں مسلسل لگا رہا۔تحریک وقف علی الاولاد اسی زمانہ میں شروع کی۔ندوہ کے اجلاس میں اس کو منظور کرایا۔ملک کے تمام بیرسٹر اور قانون دانوں سے رابطہ کیا۔ان میں ایک نام علامہ اقبال کا تھا تو دوسرا مسٹر مظہرالحق کا۔اسی سلسلہ میں وہ محمد علی جناح سے بھی ملے تھے۔بالآخر وہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی۔اس سلسلہ میں علماء سے فتاوے حاصل کئے۔دستخطی مہم چلائی۔نتیجہ یہ ہوا کہ محمد علی جناح نے اسے پارلیامنٹ میں بل کی شکل میں پیش کیا اور حکومت نے بطور قانون منظور کیا۔

تعطیل نماز جمعہ بھی ان کا اسی دور کا کارنامہ ہے۔اسی زمانہ میں شدھی تحریک نے زور پکڑا اور ارتداد کی لہر اُٹھی تو ان کی جان پہ بن آئی۔خود انھوں نے شاہ جہاں پور وغیرہ کا دورہ کیا۔راجپوتانہ میں معتمد اشخاص بھیجے اور اس کے سدباب کے لئے اصول وضوابط بنائے اور ایک زمانہ تک فکر مند رہے۔ان تمام سرگرمیوں کے ساتھ ماہنامہ الندوہ کی ادارت کرتے رہے اور اس کو اپنی کوششوں اور تحریروں سے ایسا رسالہ بنا دیا،جس نے اندھیرے میں روشنی کا کام لیا اور بے شمار لوگ اس سے مستفید ہوئے۔الندوہ سے انھوں نے ایک اور بہت بڑا کام لیا،تصنیف وتالیف کے لئے انھوں نے اسی رسالہ کے ذریعہ طلبائے ندوہ کی تربیت کی۔مولانا سید سلیمان ندوی مولانا عبدالسلام ندوی،عبداللہ عمادی وغیرہ نے یہیں قلم پکڑنا سیکھا اور آسمان علم وادب پر اہل قلم کی حیثیت سے چمکے،مولانا ابوالکلام آزاد بھی چند ماہ الندوہ کے نائب ایڈیٹر رہے اور شبلی کی صحبت اور ان کے چشمۂ شیریں سے اپنی تشنگی بجھائی۔

ندوہ کی ان حد درجہ کی مصروفیات کے ساتھ ان کا سلسلہ تصنیف تالیف بھی مسلسل

جاری رہا۔ پہلے موازنہ انیس و دبیر لکھی۔ پھر شعر العجم کی چار جلدیں یہیں لکھیں۔ موازنہ اور شعر العجم کی اہمیت سے اہل علم و ادب بخوبی واقف ہیں۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ ندوہ کی مذکورہ بالا مصروفیات اور الجھنوں میں ایسی عظیم الشان کتابیں سپرد قلم کی جا سکتی ہیں۔ الندوہ کے سیکڑوں مضامین، جلسہ ندوہ کی سالانہ رودادیں اور سیکڑوں خطوط و خطبات کے ساتھ ساتھ ایسی اہم اور معرکۃ الآراء کتابوں کی تصنیف ایک عبقری ہی کے بس کی باتیں تھیں۔

شعر العجم ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان کا پرواز تخیل دربار رسالت میں پہونچ گیا اور انھوں نے سیرۃ النبی کو ہر کام پر فوقیت دی اور اس کے لئے بڑی جدوجہد کی، جس کی تفصیل حیات شبلی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بالآخر انھوں نے اس عزم کے ساتھ کہ ’’اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی‘‘۔ سیرت کا آغاز کیا اور واقعی ایسی ہی عظیم الشان سیرۃ النبیؐ ان کے قلم سے نکلی اور اسی لازوال کتاب پر ان کے قلم کی سیاہی خشک ہوئی۔ ان کی صحت پہلے سے خراب تھی۔ اسی زمانہ میں ان کے بھائی محمد اسحاق ایڈوکیٹ نے یکا یک جوانی میں انتقال کیا، جس سے وہ بہت دل برداشتہ ہوئے اور خون کے آنسو روئے۔ زیر نظر کتاب میں ان کا مرثیہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۱۳ء میں وہ ندوہ میں مخالفین کی روز، روز کی پیدا کردہ الجھنوں سے تنگ آکر مستعفی ہوئے اور اعظم گڈھ آکر دار المصنّفین کے قیام کا سامان کرنے لگے۔ شہر کے قلب میں واقع اپنا باغ اور بنگلہ وقف کیا۔ مہمان خانہ کی تعمیر کرائی۔ طلبہ کو بلایا۔ اس کے مالی انتظامات کی فکر میں تھے کہ ان کا وقت آخر آپہونچا اور وہ سیرت سیرت کہتے ہوئے اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کا انتقال ہوا۔ پورے ملک میں ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔ بیگم سلطان جہاں فرماں روائے بھوپال نے کہا کہ ’’فقیر بےنوا چل بسا اور اب سلطان کی باری ہے‘‘۔ دار المصنّفین کے احاطہ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کے مزار

پر انہی کے یہ اشعار کندہ ہیں ؎

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

بلا شبہ علامہ شبلی نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے مایہ ناز عالم ومصنف اور مفکر اور ادیب وانشا پرداز تھے ۔ان کی بلند پایہ دینی خدمات جہاں اسلامی تاریخ کے روشن باب کا حصہ ہیں، وہیں ان کی ادبی خدمات ادبیات عالم کا جز و جمیل ۔اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔

[۱]

جنرل عظیم الدین خاں (۱)

اگر چہ ہم خاک نشینوں کو ملکی ارکان سے بہت کم واسطہ رہتا ہے تا ہم جب واقعہ عالم آشوب و جاں گداز ہوتا ہے وہ کسی کو بے اثر نہیں چھوڑتا۔ اس قحط الرجال میں جنرل عظیم الدین خاں مرحوم سے جو بہادرانہ اور ملکی قابلیتیں ظہور میں آئی تھیں ان کے لحاظ سے ان کی عبرت انگیز موت عجیب افسوس ناک حادثہ ہے۔ مجھ کو اس مرحوم سے کسی قسم کا واسطہ نہ تھا لیکن ان کے مردانہ اوصاف اکثر سنے اور دیکھے تھے۔ اس خبر کے سننے سے نہایت قلق ہوا اور یقین ہو گیا کہ خدا ہی کو منظور ہے کہ ہماری قوم میں لائق لوگ نہ رہنے پائیں۔ اسی رنج اور قلق میں کچھ اشعار مرثیہ کے طور پر موزوں ہوئے، وہ آپ کی خدمت میں مرسل ہیں۔

[۱۷/اپریل ۱۸۹۱ء] (۲)

(مکتوبات شبلی ص: ۲۲۳، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳)

مرثیہ

(۱۸۹۱ء)

تا کے زغمِ نہاں نگویم   گویند مگو، چساں نگویم
دارم جگری دمے توانم   کا فسانۂ پاستاں نگویم
از عربدۂ فلک ننالم   از نیک و بد جہاں نگویم
از نالۂ دل اثر نخواہم   از داغِ جگر نشاں نگویم
رفت انچہ ز دور چرخ برمن   یک حرف ازان میاں نگویم

ایں جملہ ہمی توانم اما　　نتواں کیں داستاں نگویم
در ماتمِ خان اعظم الدین　　جز قصهٔ خوں چکاں نگویم

آه از غمِ ایں چنیں امیرے
شیر افگن و شیر وشیر گیرے

آه آں بر و دوش وبرزو بالای　　آں پیکر و روی وقد زیبای
آں زور سپہبدی بیازوی　　آں فرّهٔ خسروی به سیمای
آں دانش وعقل وہوش وفرہنگ　　آں حوصلہ و درایت و رای
آں کو بہ شرف نداشت مانند　　آں کو بہ ہنر نداشت ہمتای
آوخ کہ چنیں بلند جاہے　　یکبار چناں بیفتد از پای
آه ایں چہ جفا ست کان برو دوش　　آلودهٔ خاک وخوں شود ہای
آں بازو تیغ باز، افسوس　　آں پنجۂ شیر گیر، ای وای
آه ایں چہ مصیبتی ست جانکاه　　آں ایں چہ غمی ست صبر فرسای

چوں زیں غمِ جانگداز گریم
گریم صد بار وباز گریم

در خاک شد آں امیر ذیجاه　　یا تہمتن اوفتاد در چاه
مہمان یکی بہ شب شد وخاست　　تا باز رود بسوے بنگاه
کم حوصلگاں سفلهٔ چند　　بودند نشستہ در کمیں گاه
کالسکہ(۳) چو در مقابل آمد　　آں کجروشان دوں بہ ناگاه
یکبار برو کشاد دادند　　شش تیر(۴) ویکے خطا نشد آه
بر جبهۂ صبر چیں نیفگند　　با آں ہمہ زخمہائے جانکاه
بر خاک فتاد وباز برخاست　　پس طے بنمود پارهٔ راه

آسود دمے براہ وزاں پس　　افسانۂ عمر گشت کوتاہ

با صد سخنی بماند خاموش

آں بحر بیارمید از جوش

ای کشتۂ ظلم ہاں خبر گیر　　ویں نالۂ ما بگوش در گیر

ایں مہ بخسوف مے نیرزو　　از چہرہ نقاب خاک بر گیر

بر خیز وہماں برسم پیشیں　　ہم تیغ بدست وہم سپر گیر

ترکانہ کلہ بفرق بشکن　　چار آئینہ و زرہ ببر گیر

مردانہ خرام و ہمرہی را　　اقبال و سعادت وظفر گیر

کیفر بستاں و دشمناں را　　آتش شود در نہاد، در گیر

آنگاہ بکار ملک پرداز　　بر ہم شدہ کار ہا ز سر گیر

آں رونقِ رام پور باز آر　　آں آئینہ را دگر بزر گیر

ایں جملہ بکام دوستاں کن

زیں بعد ہر انچہ خواہی آں کن

(کلیاتِ شبلی فارسی ص: ۴۰،۴۱، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۵ء)

تعلیقات وحواشی:

(۱) جنرل عظیم الدین خاں نائب السلطنت ریاست رام پور، تاریخ پیدائش ۲۵/ فروری ۱۸۸۹ء، تاریخ شہادت ۴/ مارچ ۱۸۹۱ء۔

(۲) یہ تحریر دراصل ایک خط ہے جو ایڈیٹر انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کو لکھا گیا ہے۔ مرثیہ گزٹ کی ۱۸/ اپریل ۱۸۹۱ء [ص ۴۳۵] کی اشاعت میں شائع ہوا۔

(۳) گاڑی (۴) گلولہ تفنگ۔

[۲]

قاضی محمد سلیم (۱)

۱۲۹۹ھ (۸۲-۱۸۸۱ء) کی بات ہے کہ میں ایک دن برادر قاضی محمد سلیم کی عیادت کو گیا۔ مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ کہنے لگے: آج رات میں نے خواب میں دیکھا کہ تم نے میرے متعلق چند اشعار موزوں کئے ہیں۔ اگر چہ مجھے اندازہ تھا کہ یہ محض فضول سی بات ہے لیکن جب اگلے دن ان کی تاریخ وفات کی جستجو کی تو ازخود یہ بات دل میں آ گئی۔ ہر چند میں نے اپنے تئیں اس سے باز رہنے کی کوشش کی، کیوں کہ یہ بجائے خود ایک بدشگونی تھی، تاہم نہ چاہتے ہوئے بھی مصرعِ تاریخ خود بخود موزوں ہو گیا، حالانکہ ممدوح کی کہی ہوئی بات میرے ذہن میں نہیں تھی۔ ان کا خواب دوسرے روز بھی مجھے یاد آتا رہا اور اس واقعے نے مجھ پر عجب کیفیت طاری کر دی۔

ایک ہفتے بعد انھوں نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کے رویائے صادقہ پر مجھے سخت تعجب ہوا اور یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ کچھ ایسے ہی لوگ عالمِ قدس کے راز دار ہوتے ہیں، جہاں پر وہم وگماں کی پرواز بھی محال ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس شعر میں مذکور ہے:

چون خواستم ز پیر خرد سال مرگ او
از زورے در وگفت کہ قاضی سلیم مرد (۲)

(اردو ترجمہ مکاتیب شبلی ص: ۳۲، ڈاکٹر خالد ندیم، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء)

تعلیقات وحواشی:

(۱) ۱۸۸۱ء : یہ وہ زمانہ ہے جب علامہ شبلی نعمانی اعظم گڑھ میں تھے۔ قیاس ہے کہ قاضی محمد سلیم اعظم گڑھ ہی کے رہنے والے تھے، مگر ان کے بارے میں کسی قسم کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۲) ''کہ قاضی سلیم مرد'' سے تاریخ وفات کے اعداد ۱۲۹۹ھ نکلتے ہیں۔

[۳]

عبدالغفار(۱)

برخوردار عبدالغفار نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دوستوں کے دلوں پر داغ جدائی چھوڑ گیا۔ اس غم سے کلیجہ منھ کو آتا ہے اور دل سنبھالے نہیں سنبھلتا، مگر حکم الٰہی کے سامنے کوئی چارہ نہیں۔ ہلکان نہیں ہونا چاہئے۔ کل تعطیل ہے اگر تم تعزیت کے لئے یہاں آنا چاہتے ہو تو جمعرات کو آ ؤ۔ (۱۴/اکتوبر ۱۸۸۲ء)

(مکاتیب شبلی ج ۲ ص: ۲۱۷-۲۱۸)

تعلیقات وحواشی:

(۱) عبدالغفار: ان کے بارے میں تفصیلات دستیاب نہ ہوسکیں، غالبًا خانوادہ شبلی کے کوئی فرد تھے۔ تاریخ بندول میں بھی کوئی تفصیل درج نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شجرہ بندول میں بھی اس نام کے کسی شخص کا اندراج نہیں۔

[۴]

والدہ مولوی محمد سمیع (۱)

برادرم مکرم مولوی محمد عمر صاحب (۲) کے خط سے معلوم ہوا کہ تمہاری والدہ کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. بھائی یہ خط لکھ کر میں تمہارا غم تازہ کرنا نہیں چاہتا۔ میں اس درد سے خوب واقف ہوں۔ اگر تمہیں صبر آگیا ہو تو وہ بھی ایک مجبوری ہے۔ ورنہ آدمی کا جگر اور یہ صدمہ ؎

این غم آنمایہ نباشد کہ کسے بردارد

مگر آخر کیا چارہ ہے ؎

شاد باید زیستن نا شاد باید زیستن

اب تم پورے یتیم ہوا اور سچ تو یہ ہے کہ سخت رحم کے قابل ہو۔ بھائی جو لوگ باپ ماں کا اس لئے ماتم کرتے ہیں کہ وہ دنیاوی فائدوں کا مرکز تھے، ان بے دردوں کا مذکور نہیں۔ ان کے دل سے پوچھئے جو والدین کی جھڑکیوں میں بھی دوسروں کے مرحبا سے زیادہ مزہ پاتے ہیں، جن کو والدین کے طمانچے بھی اصلی ہمدردی کی یادگار بن کر سامنے آتے ہیں جن کو یہ خیال بے چین کر دیتا ہے۔ ہائے وہ کیا ہوئے جو ہماری تکلیفوں میں ہم سے زیادہ تڑپ جاتے تھے۔ بھائی یہ لوگ قسمت سے ساتھ رہتے ہیں اور گئے تو پھر اپنا قائم مقام بھی چھوڑ کر نہیں جاتے۔ ہائے یہ خیال اور ستاتا ہے کہ روحیں اب بھی چین سے نہیں، ہمارا خیال اب بھی ان کے لئے مایۂ آزار ہے۔ خیر میری طرح تمہیں بھی خدا صبر دے۔ (۲۸ رجنوری ۱۸۸۶ء) (مکاتیب شبلی ج۱،ص:۸۱۔۸۲،مولانا سید سلمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ)

تعلیقات وحواشی:

(۱) مولوی محمد سمیع، موضع کوزہ گہنی ضلع اعظم گڑھ کے باشندہ اور علامہ شبلی کی ابتدائی شاگردوں میں تھے۔علامہ شبلی کوان سے اوران کوعلامہ شبلی سے بڑی محبت تھی۔ان کے پاس علامہ شبلی کے خطوط اور کلام کا ایک ذخیرہ تھا جسے انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کے حوالہ کیا تھا۔ جس میں علامہ شبلی کی ایک بیاض بھی تھی جو عرصہ تک کتب خانہ دارالمصنّفین میں تھی، مگر اب دستیاب نہیں۔ان کے نام علامہ شبلی کے ۵۷رخطوط مکاتیب شبلی اول اور ۱۱رخطوط حصہ دوم میں شامل ہیں۔جن سے گونا گوں اور نج کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں موازنہ ترقی قومی کے نام سے جو تنظیم بنائی تھی اس کے سکریٹری یہی مولوی محمد سمیع صاحب تھے۔نیشنل اسکول کے بھی وہ ذمہ دار تھے۔علامہ شبلی کا دوسرا عقدانھیں کی ماموں زاد بہن صغری سے ہوا تھا جو موضع خاص ڈیہہ کی رہنے والی تھیں۔ ۱۹۱۶ء میں مکاتیب شبلی کی اشاعت کے وقت مولوی محمد سمیع صاحب جون پور میں محافظ دفتر تھے۔اس کے علاوہ ان کے بارے میں کوئی تفصیل دستیاب نہیں۔علامہ شبلی کے اس قدر شیدائی کی وفیات بھی معارف میں نہیں لکھی گئی کہ کچھ حالات محفوظ ہو جاتے۔

(۲) مولوی محمد عمر علامہ شبلی کی نو جوانی کے دوست تھے،مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ

> ''مولانا کے ہم تعلیم وہم صحبت اور عہد شباب کے دوست،اعظم گڑھ میں محافظ دفتر ہیں۔نیز مطب کرتے ہیں۔مدرسہ دیوبند میں تعلیم پائی ہے''۔
>
> (مکاتیب شبلی حصہ اول ص:۵۴)

یہ بندول کے رہنے والے تھے۔مکاتیب شبلی میں اردو وفارسی کے ۶رخطوط ان کے نام کے شامل ہیں۔انھوں نے علامہ شبلی کے ابتدائی دور کا بعض کلام بھی سید صاحب

کو فراہم کیا تھا۔ افسوس ان کی وفات پر معارف میں چند سطری نوٹ بھی نہیں لکھا گیا۔

مولوی محمد سمیع اور مولوی محمد عمر کے بارے میں مذکورہ چند سطروں کے علاوہ کچھ معلومات نہیں ملتیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے ان متعلقین اور شیدائیوں سے کیوں کر صرف نظر کیا گیا۔

[۵]

شیخ حسن علی (دادا)

افسوس ہے کہ جناب جدامجد نے بیاسی برس کی عمر میں تین چار دن ہوئے انتقال کیا(۱)۔ اگر چہ ان کی عمر پوری ہو چکی تھی لیکن چونکہ ان کی موت نا گہانی طور پر ایک صدمہ سے ہوئی (۲)، اس لئے لوگوں کو نہایت رنج ہوا۔ ان کے تمام قوی درست تھے۔ میں نے رسالہ حسن (۳) ان کو دیا تھا تو بغیر عینک کے پڑھ گئے۔ خدا مغفرت کرے۔ میں اعظم گڑھ نہیں گیا، نہ قصد ہے لیکن چونکہ اس حادثہ کی وجہ سے والد قبلہ (۴) خود آئے تھے سامنا ہو گیا، میں جلد تر یہاں (۵) سے روانہ ہوں گا (۶)۔ (یکم جون ۱۸۹۰ء) (مکتوبات شبلی ص:۱۲)

تعلیقات وحواشی:

(۱) علامہ شبلی کے دادا شیخ حسن علی، رئیس بندول نے ۲۷، ۲۸ رمئی ۱۸۹۰ء کو وفات پائی۔

(۲) صدمہ کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

(۳) ماہنامہ حسن، حیدرآباد کا مشہور رسالہ جس میں علامہ شبلی کے بعض مضامین شائع ہوئے اور رسالہ کے دستور کے مطابق علامہ شبلی کو انعام میں ایک اشرفی ملی۔

(۴) شیخ حبیب اللہ وکیل [۱۲؍ نومبر ۱۹۰۰ء] اعظم گڑھ کے مشہور وکیل اور مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ کے بانی اور علی گڑھ تحریک کے ابتدائی ہمدردوں میں تھے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، راقم کا مضمون مشمولہ ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط''۔ (ص: ۱۵۷-۱۶۵)

(۵) علی گڑھ سے اعظم گڑھ کے لئے

(۶) یہ خط سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کے نام لکھا گیا ہے۔

[۶]

مہدی حسن بیرسٹر (۱)

لو بھائی ہم میں کا ایک عنصر کم ہو گیا۔عزیزی مہدی نے جان دی اور کس حالت کے ساتھ کہ کلیجے کے ٹکڑے اڑ گئے۔

میں بد بخت پاس تھا اور اس لئے جتنے تیر پھینکے سب میرے ہی جگر پر لگے۔ہائے اس کی جوانہ مرگی۔ہائے کیا معلوم تھا کہ وہ اس قدر جلد دنیا سے جائے گا، ورنہ مجھ پر لعنت اگر میں اس سے ناراض رہتا۔

ہائے سب برائیوں پر وہ سب سے اچھا تھا۔آج چوتھا دن ہے لیکن خدا کی قسم اس وقت تک دل نہیں ٹھہرتا۔سو بار رو چکا ہوں اور دل نہیں ٹھہرتا۔اس کی ایک محبوب یادگار ہے جسے وہ بہن کہتا تھا یعنی شافیہ (۲)۔اس سے بارہا لپٹ کر رویا ہوں لیکن کچھ بھی تو تسلی نہیں ہوتی۔اس کو تسلی دینا چاہتا ہوں، لیکن خود بےقرار ہو جاتا ہوں۔ایک اور اس کے نام سے وابستہ بدقسمت ہے جو پہلے چھوٹی بھاوج تھی لیکن اب پیاری بہن ہے (۳)۔

تم لوگ (۴) مزے سے باہر ہو۔یہاں آفت زدوں کو سنبھالنا میرے سر چھوڑا ہے۔ہائے مہدی، وائے مہدی، بد بخت ازلی شبلی (۲/جولائی ۱۸۹۷ء)

(مکاتیب شبلی ج ۱، ص: ۹۹-۱۰۰)

تعلیقات وحواشی:

(۱) مسٹر مہدی حسن علامہ شبلی کے چھوٹے بھائی اور خطۂ اعظم گڑھ کے پہلے بیرسٹر تھے۔ان

کی ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں ہوئی۔ عربی وفارسی کے بعد قرآن مجید حفظ کیا، پھر انگریزی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۹ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے لئے ایم، اے، او کالج علی گڑھ گئے۔ یہاں سے ۱۸۸۱ء میں انٹرنس اور ۱۸۸۴ء میں ایف اے پاس کیا۔ اس کے بعد اپریل ۱۸۸۵ء میں بیرسٹری کے لئے لندن گئے، تین سال بعد ۸/اکتوبر ۱۸۸۸ء کو بی، اے اور بارایٹ لا کی سند لے کر وطن لوٹے۔ لیکن ان کی صحت لندن کے زمانہ قیام میں خراب ہوگئی تھی، وطن آکر بھی بحال نہ ہوئی، مجبوراً اپنے مرتبے سے اتر کر جنوری ۱۸۹۲ء میں الہ آباد ہائی کورٹ میں منصفی کا عہدہ قبول کرلیا۔ علالت دن بدن بڑھتی گئی، بالآخر اسی بیماری میں ۲۹/ جون ۱۸۹۷ء کو اعظم گڑھ میں وفات پائی۔ بندول میں مدفون ہیں۔

(۲) شافیہ: مسٹر مہدی حسن کی یادگار یہی ایک بیٹی تھیں۔ ان کا نکاح ان کے ماموں زاد بھائی حاجی شیخ محمد موضع پھریہا سے ہوا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں حج کے دوران انھوں نے مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

(۳) مسٹر مہدی حسن کی بیوہ عالیہ جو بندول ہی کی تھیں۔

(۴) یہ ایک خط ہے جو علامہ شبلی نے مولوی محمد سمیع کے نام لکھا ہے۔

[۷]

سرسید احمد خاں (۱)

نمی دانم حدیث نامہ چون است
ہمی دانم کہ عنوانش بخون است

تزعزت ارکان الملة اعنی انتقل السید احمد خاں بہادر الی جوار رحمه ربه وذالك یوم الاحد ۲۷/ مارچ وتفرق شملنا، انی لا اقدر علی ان اشتغل بشیء الا بعد برھة الزماں
(شبلی نعمانی علی گڑھ، ۲۹/ مارچ ۱۸۹۸ء) (۲)

قومی عمارت کے ستون ہل گئے یعنی سرسید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں گئے اور یہ سانحہ یکشنبہ ۲۷/ مارچ کو پیش آیا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا میں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں کر سکتا۔ شبلی نعمانی

(مکاتیب شبلی ج ۲، ص: ۲۲۷، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۲)

تعلیقات وحواشی:

(۱) سرسید احمد خاں [۱۸۱۷ء۔ ۱۸۹۸ء] بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ، علامہ شبلی کے محسن ومربی تھے۔ انہی کے فیض صحبت اثر سے فکر شبلی میں انقلاب برپا ہوا اور انہی نے سب سے پہلے علامہ شبلی کے علم وفضل اور اسلوب نگارش کی داد دی۔

(۲) یہ عربی میں ایک خط ہے جو علامہ شبلی نے اپنے دوست نواب سید علی حسن خاں [۱۸۶۶۔ ۱۹۳۰ء] کو علی گڑھ سے لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہے۔

[۸]

اہلیہ نواب مزمل اللہ خاں (۱)

جو صدمہ آپ کو پہنچا اس سے نہایت افسوس ہوا۔ واقعی ایک ایسی رفیق مونس کا جدا ہونا سخت جاں گداز ہے۔ یہ کہنا کہ خدا نعم البدل عطا کرے اگر چہ رسمًا جائز بلکہ معمول ہے، لیکن میں اس کو مرحومہ کی روح کی دل شکنی خیال کرتا ہوں۔ خدا آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔ (۲۱ر جنوری ۱۹۰۵ء)

(مکتوبات شبلی ص:۱۰۲)

تعلیقات وحواشی:

(۱) نواب مزمل اللہ خاں [م: ۲۸ر ستمبر ۱۹۳۸ء] کی تیسری اہلیہ جو ۱۹۰۳ء میں ان کے نکاح میں آئی تھیں، محض دو برس بعد انتقال کیا۔ بقیہ تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

نواب مزمل اللہ خاں رئیس بھیکم پور شروانی خاندان کے چشم و چراغ اور علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے۔ بڑے مخیّر وفیاض تھے۔ قومی وملی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ان سے متعدد ادارے فیض یاب ہوئے۔ ندوہ اور دارالمصنّفین کے وہ بڑے خیر خواہ تھے۔ دارالمصنّفین کی موتی مسجد انھیں کے پیسے سے تعمیر ہوئی ہے۔

[۹]

اہل خانہ(۱)

میں ایک مہینہ سے ایک مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں، یعنی اہل خانہ علیل ہیں اور علالت ایسی کہ نہ زندہ نہ مردہ۔ لکھنؤ علاج کے لئے لے گیا، پھر مایوس ہو کر لایا۔ اب اعظم گڑھ میں لاشہ کا معتکف ہوں۔ ۲۶/ستمبر ۱۹۰۵ء (مکتوبات شبلی ص ۸۶)

اہل خانہ نے انتقال کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ۷/اکتوبر ۱۹۰۵ء

(ایضاً ص ۸۷)

تعلیقات وحواشی:

(۱) علامہ شبلی کی دوسری اہلیہ جو ۱۹۰۱ء میں ان کے نکاح میں آئیں غالباً ۶/ ۷/اکتوبر ۱۹۰۵ء کو انتقال کیا۔ ان سے تین بچے پیدا ہوئے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا، سب بچپن ہی میں فوت ہوئے۔ غالباً دونوں بچیوں نے حیدرآباد میں انتقال کیا اور ایک بیٹے نے لکھنؤ میں وفات پائی جب وہ منشی احتشام علی [۱۸۳۹۔۱۹۴۳ء] کے مکان میں کرایہ دار تھے۔ ان کا نام غالباً صغری تھا۔ یہ مرزا محمد نعیم موضع خاص ڈیہہ ضلع اعظم گڑھ کی صاحبزادی اور مولوی محمد سمیع جو علامہ کے شاگرد اور ہمراز تھے کی ماموں زاد بہن تھیں۔ قیام لکھنؤ کے زمانہ میں بیمار ہوئیں لیکن علاج ومعالجہ بے سود رہا۔ ۱۹۰۵ء میں بندول میں انتقال کیا، جس دن ان کا انتقال ہوا اسی دن لکھنؤ سے مولانا ابوالکلام آزاد بندول پہنچے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ان کے انتقال پر علامہ شبلی پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ دوسرے دن مولانا آزاد کے ساتھ ہی ندوہ کے لئے لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۱۹۶)

مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کے علامہ شبلی کے ساتھ اعظم گڑھ آنے کا ذکر کیا ہے اور اسی پر اعتبار کر کے راقم نے مکتوبات شبلی میں ساتھ آنے کا ذکر کیا گیا تھا، مگر یہ درست نہیں۔ مولانا آزاد نے بعد میں اعظم گڑھ پہنچنے کا ذکر صراحت سے کیا ہے۔ (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۱۹۶-۱۹۷)

علامہ شبلی کی مذکورہ اہلیہ کا نام اب تک معلوم نہ تھا۔ زہرا بیگم [۱۸۶۶-۱۹۴۰ء] کے ایک خط کے جواب میں مولانا شبلی نے صغری اور فاطمہ خانم کو بہن کہنے پر ٹوکا ہے۔ (خطوط شبلی ص ۸۸) بعض لوگوں نے صغری کو فاطمہ خانم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ خط میں ان کا نام موجود ہے، چونکہ علامہ شبلی کی دوسری صاحبزادی رابعہ خانم کا ۱۹۰۴ء میں انتقال ہو چکا تھا، اس لئے قیاس ہے کہ صغری علامہ شبلی کی دوسری اہلیہ کا نام تھا۔ خود علامہ شبلی رابعہ یا فاطمہ کا نام صغری کیوں کر لکھتے۔؟

اس خط کی تاریخ سے مولانا ابوالکلام آزاد کے الندوہ سے وابستہ ہونے کی تاریخ بھی متعین ہوتی ہے کہ وہ اوائل اکتوبر ہی میں لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔

[۱۰]

شاہ امانت اللہ غازی پوری (۱)

قبل اس کے کہ آج اور کوئی کارروائی شروع کی جائے ایک افسوس ناک لیکن ناگزیر اور ضروری کام ندوہ کے سامنے ہے۔ آپ صاحبوں کو شاید معلوم ہو کہ مولانا شاہ امانت اللہ صاحب نے جو ایک مشہور اور معروف بزرگ اور ہماری مجلس ندوۃ العلماء کے بہت بڑے رکن اور معاون تھے، چند روز ہوئے دار فانی سے عالم جاودانی کو انتقال فرمایا۔ مولانائے مرحوم کے اوصاف وفضائل کی تفصیل اس وقت بیان نہیں کی جاسکتی، لیکن اس قدر کہنا ضروری ہے کہ مولانا میں ایسی بہت سی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ تمام علماء کی جماعت میں ایک ممتاز اور جداگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ وہ جس عظمت وشان، خودداری اور پاس وضع، بلند نظری اور عالی حوصلگی سے بسر کرتے تھے، اس سے اسلامی شان کا جلوہ نظر آتا تھا۔ جب وہ وعظ وتبلیغ کی ضرورت سے سفر کرتے تھے تو جس طرف ان کا گذر ہوتا تھا ایک قافلہ پڑ جاتا تھا اور غیر مذہب والوں پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ وہ ندوۃ العلماء کے بہت بڑے قوت وبازو تھے۔ اکثر جلسوں میں تشریف لاتے تھے۔ ندوہ کے وفود کے ساتھ سفر کرتے تھے اور جب ارکان ندوہ نے غازی پوری کا سفر کیا تو مولانا نے جس عظمت وشان سے ندوہ کی جماعت کا استقبال کیا کسی بڑے سے بڑے حاکم یا افسر کو بھی کسی موقع پر یہ بات نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ مولانائے مرحوم کی ذات گرامی سے ندوہ کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، لیکن افسوس ہے کہ ہماری بدقسمتی سے موت نے سب کا خاتمہ کردیا۔ لیکن جہاں ہم کو مولانا کے بے وقت انتقال کرنے سے سخت صدمہ پہونچا ہے یہ بات تسلی اور اطمینان کے قابل

ہے کہ ان کے فرزند مولوی شاہ ابوالخیر صاحب (۲) جو اس موقع پر تشریف رکھتے ہیں، مولانائے مرحوم کے ایسے قائم مقام ہیں جن سے ہم کو وہی تمام امیدیں ہیں جو مولانائے مرحوم کی ذات سے تھیں۔ مولوی ابوالخیر صاحب کی وجاہت، فصاحت لسانی، صورت وشکل، لب ولہجہ سے ہر شخص قیاس کرسکتا ہے کہ جس طرح ان ظاہری اور محسوس باتوں میں وہ اپنے بزرگوار کے نمونہ اور گویا ان کی تصویر ہیں، اسی طرح تمام اور محاسن اور اخلاق میں بھی وہ سرتا پا مولانائے مرحوم کی نظیر ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ غازی پور میں جو مولانا کا محل اقامت تھا مسلمانوں نے ان کو مولانائے مرحوم کا سجادہ نشیں تسلیم کیا اور خاص غازی پور کے لوگوں سے زیادہ کوئی شخص قائم مقامی کے حق کا اندازہ نہیں کرسکتا ہے۔ مولوی ابوالخیر صاحب کو ندوہ کے اجلاس میں ہم اس حیثیت سے دیکھتے ہیں، جس طرح ان کے والد بزرگوار کو دیکھتے تھے اور ان کی ذات سے ہم کو وہی تمام امیدیں ہیں جو مولانائے مرحوم کی ذات سے تھیں۔ آخر میں یہ تحریک پیش کرتا ہوں کہ ندوہ کی طرف سے اظہار تاسف کے ساتھ مولانائے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی جائے اور یہ امر درج کارروائی اجلاس ہذا کیا جائے۔

(خطبات شبلی ص ۵۲۔۵۳، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰)

تعلیقات وحواشی:

(۱) مولانا شاہ امانت اللہ فصیحی غازی پوری [م: ۱۹۰۶ء] ایک ذی علم خانوادہ کے چشم وچراغ اور اپنے عہد کے ممتاز عالم تھے۔ سرسید احمد خاں نے غازی پور میں سائنٹی فک سوسائٹی قائم کی تو انھیں رکن نامزد کیا۔ وہ ندوہ کے بھی رکن تھے اور اس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔ عرصہ تک مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا۔ فارسی میں ایک کتاب ''ہدایۃ الاسلام'' ان کی یادگار ہے جو ۱۳۱۵ھ [۱۸۹۷ء] میں شائع ہوئی۔ ان کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ البتہ سنہ وفات ۱۹۰۶ء ہے۔

(۲) مولانا شاہ ابوالخیر فصیحی شاہ امانت اللہ فصیحی کے خلف الرشید تھے۔ بڑے خطیب اور مقرر تھے۔ دور دور تک وعظ کہنے جاتے۔ مہاراجہ گوالیار ان کا معتقد تھا۔ حکومت کی طرف سے شمس العلماء اور خان بہادر کے خطابات ملے۔ افسوس ایسے جلیل القدر عالم وواعظ کے سنہ ولادت ووفات مذکور نہیں۔

[۱۱]

والدہ مولوی ریاض حسن خاں خیال(۱)

خط پہنچا، نہایت افسوس ہوا۔(۲) میں اس دولت کو آغاز شباب میں کھو چکا ہوں لیکن اب تک یہ حالت ہے کہ کسی کو جب دیکھتا ہوں کہ اس کے والدین سر پر موجود ہیں تو بخدا عجیب حسرت ہوتی ہے۔ آپ کے رنج وافسوس کا کچھ میں ہی خوب اندازہ کرسکتا ہوں۔(۲۲/ مارچ ۱۹۰۶ء)

(مکاتیب شبلی ج۲ص ۱۵۷)

تعلیقات وحواشی:

(۱) مولوی ریاض حسن خاں خیال[۱۸۷۷-۱۹۵۳ء] رئیس رسول پور بڑے وجیہ اور باوقار شخص تھے۔ اردو وفارسی میں داد سخن دیتے تھے۔ ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے۔ عرصہ تک خط وکتابت رہی۔ ان کے نام علامہ شبلی کے مکاتیب شبلی حصہ دوم میں ۲۳/خطوط شامل ہیں، جن سے گہرے روابط ظاہر ہوتے ہیں۔ علامہ شبلی نے ان سے ملاقات کے لئے جنوری ۱۹۰۷ء میں رسول پور کا سفر بھی کیا اور ان کے چچا مسٹر محبوب حسن بیرسٹرایٹ لا کے مہمان رہے۔ اس موقع پر ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں علامہ شبلی نے اسلام کی حقیقت اور ندوہ کی ضرورت پر تقریر کی۔(حیات شبلی ص ۴۴۵) ۱۹۰۷ء میں علامہ شبلی کے حادثہ پا پر جن لوگوں نے اعظم گڑھ آکر عیادت کی ان میں ریاض حسن خاں خیال اور ان کے بھائی اعجاز حسن خاں کا نام بھی شامل ہے۔(ایضاً ص ۴۵۳)

(۲) خیال کی والدہ کی وفات کی خبر پر یہ تعزیتی مکتوب لکھا گیا ہے۔

[۱۲]

حادثہ پا(۱)

ایک اتفاقی تقریب سے میں اپنے وطن اعظم گڑھ میں آیا تھا اور ارادہ تھا کہ مہینہ دو مہینہ یہاں قیام کروں گا۔ شعر العجم کے اجزاء زیرِ تحریر تھے اور شاہ نامہ پر ریویو کر رہا تھا۔ سترہویں مئی ۱۹۰۷ء تقریباً دس بجے ہوں گے کہ میں دفتر سے اٹھ کر زنانہ کمرے میں آ گیا۔ اندر تخت بچھے ہوئے تھے۔ پاؤں لٹکا کر تخت پر بیٹھ گیا۔ تخت پر کارتوس بھری ہوئی بندوق رکھی تھی۔ میں نے ہاتھ میں اٹھا لی اور پھر ایک دوسرے شخص کے ہاتھ میں دیدی۔ اتفاق سے گھوڑا گر گیا۔ بندوق کی زد ٹھیک میرے پاؤں پر تھی۔ بندوق کی نال سے پاؤں تک صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا۔ کارتوس میں اگرچہ چھرے تھے لیکن چونکہ بڑے تھے اور فاصلہ بہت کم تھا اس لئے ٹخنے کی ہڈی بالکل چور ہوگئی اور پاؤں کٹ کر صرف دو تسمے لگے رہ گئے۔ جس وقت ضرب لگی مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ پاؤں کو ایک جھٹکا سا لگا، کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی۔ جھٹکے کے بعد بندوق کے چھوٹنے کی آواز محسوس ہوئی۔ اس وقت میں نے گھبرا کر کہا یہ کیا ہوا۔ آواز سن کر باہر سے بعض آدمی اندر آ گئے۔ اس وقت میں اسی طرح پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا اور پاؤں میں جوتے تھے۔ ایک عزیز نے آ کر میرے پاؤں پر ہاتھ رکھا تو میں نے پاؤں جوتے میں سے نکال لیا، اس وقت پاؤں کی ایڑی جوتے میں پھنس کر رہ گئی۔ میں نے پاؤں اوپر اٹھایا اور نوکروں سے کہا اس پر پانی ڈالو۔ پانی جب ڈالا جاتا تھا تو پاؤں میں سے بھک بھک دھواں نکلتا تھا۔ قریباً پاؤ گھنٹہ تک پاؤں اٹھائے بیٹھا رہا۔ جب پنڈلیاں دکھنے لگیں تو میں نے آدمی سے کہا کہ اب ایک تکیہ لا کر میرا پاؤں اس پر

رکھ دو۔ آدمی نے رو کر کہا کیا چیز ہے جو رکھی جائے۔ مجھ کو اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ میری ایڑی جدا ہو کر جوتے میں رہ گئی ہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ابتداء میں ایک فوری نظر کے سوا مطلق اپنے پاؤں پر نظر نہیں ڈالی اور جو کچھ میں نے پاؤں کے متعلق حالات بیان کئے ہیں وہ ڈاکٹر اور دیگر حاضرین کی زبانی ہیں۔

اس وقت خاص عزیزوں میں سے کوئی نہ تھا نوکر اور ماما وغیرہ تھیں۔ یہ لوگ سخت زار وقطار روتے تھے اور میں ان کو منع کرتا تھا۔ قریباً ایک گھنٹہ کے بعد فرزند عزیز محمد حامد (۲) آیا اور زخم کو دیکھتے ہی چیخ اٹھا اور بہت بے قراری کے ساتھ گریہ وزاری کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس پر غشی سی طاری ہوگئی۔ میں نے نوکروں سے کہا اس کے منہ پر پانی چھڑکو اور حلق میں پانی ٹپکاؤ۔ اس سے اس کو ہوش آ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے چھوٹے عزیزی بھائی جنید (۳)، سول سرجن اور اسسٹنٹ سول سرجن کو ساتھ لے کر آئے۔ بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ جو رگیں کٹ گئی تھیں ان سے شدت کے ساتھ خون جاری تھا اور نہ خود مجھ کو اور نہ نوکروں چاکروں میں کسی کو خیال آیا کہ ان پر پٹی کس کر باندھ دیں جس سے خون رک جائے۔

بہرحال ڈاکٹر نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ رگوں کے منہ باندھ دیئے، جس سے خون رک گیا۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ اگر پاؤں جوڑنے کے قابل ہو تو خیر ورنہ سرے سے نکال ڈالئے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ پاؤں کاٹنے کے بغیر چارہ نہیں۔ غرض بے ہوشی کی دوا پلائی گئی اور عمل جراحی شروع کیا۔ چونکہ ہڈیاں کچھ اوپر تک پھٹ گئی تھیں، اس لئے نصف پنڈلی جدا کر دی گئی (اور متصل ہرزہ گردی کی سزا دی گئی)۔ عمل جراحی کے پورے ہونے کے دس پندرہ منٹ بعد مجھے ہوش آیا اور زخموں کے ٹانکے اور رگوں کی کھچاوٹ کی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ آج نواں دن ہے۔ ڈاکٹر ایک دن بیچ دے کر زخم کھولتا ہے، دھوتا ہے اور پھر باندھ دیتا ہے۔ تکلیف میں ابھی تک کوئی کمی نہیں ہے، لیکن خدا کا شکر

ہے کہ ابتدائے واقعہ سے اس وقت تک طبیعت کی طمانیت اور سکون میں کوئی کمی نہیں ہے۔ سوچتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ جو شخص سر کاٹے جانے کے قابل ہو اس کے پاؤں کاٹے گئے تو کیا ہوا؟

ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی تسکین ہے کہ پچاس برس سے بھی زیادہ کی کچھ عمر پائی۔ بہت چلا پھرا، دوڑا دھوپا، آخر کہاں تک؟ خود پاؤں توڑ کر بیٹھنا چاہئے تھا، نہ بیٹھا تو قسمت نے بیٹھا دیا ؎ گر نستانی بہ ستم میر

خدائے بے نیاز کا شکر گذار ہو۔ احباب و اعزہ کا منت پذیر ہوں۔ بچ گیا تو پھر کسی نہ کسی طرح دوستوں کو دیکھ لوں گا، ورنہ ان شاء اللہ تعالیٰ اب دوسرے عالم میں ملاقات ہوگی۔

[۲۵ر مئی ۱۹۰۷ء] (مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۵۵۔۱۵۷)

تعلیقات وحواشی:

(۱) یہ ایک خط ہے جو حادثہ پا پر نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۷۔۱۹۵۰ء] کو لکھا گیا تھا۔

(۲) محمد حامد حسن [۱۸۸۰۔۱۹۴۲ء] علامہ شبلی کے اکلوتے فرزند، علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی، بعد ازاں، تحصیل داری کا امتحان پاس کر کے دیوگاؤں میں نائب تحصیل دار مقرر ہوئے۔ ترقی پا کر تحصیل دار ہوئے۔ کچھ دن گورکھپور میں تعینات رہے۔ پھر جون پور تبادلہ ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں جونپور میں وفات پائی۔ شبلی منزل میں اپنے والد کے پہلو میں مدفون ہیں۔ ان کے نرینہ اولاد نہیں تھی۔ شبلی کالج کے مشہور پرنسپل شوکت سلطان مرحوم ان کے داماد تھے۔

(۳) جنید نعمانی [م: ۱۹۳۳ء] علامہ شبلی کے سب سے چھوٹے بھائی، علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ کان پور کے سب جج تھے۔ وہیں بیمار ہوئے، علاج کے لئے دہلی گئے۔ وہیں ۱۹۳۳ء میں وفات پائی اور دہلی ہی کی خاک کے سپرد ہوئے۔

[۱۳]

منشی اطہر علی کاکوروی (۱)

ہم نہایت افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ خان بہادر منشی اطہر علی صاحب وکیل نے جوندوہ کے ایک پرجوش انتظامی ممبر تھے ماہ گذشتہ میں مدینہ طیبہ میں انتقال کیا۔ مرحوم ان لوگوں میں تھے جنھوں نے ندوۃ العلماء کو ہر موقع پر ہر قسم کی مدد دی۔ لکھنؤ میں ندوہ کا (دوسرا) اجلاس خاص منشی صاحب مرحوم کے اہتمام اور صرفہ سے انجام پایا تھا۔

منشی صاحب ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ ہی میں حج سے فارغ ہو چکے تھے، مگر سرزمین حجاز نے کچھ دنوں کے لئے اور رکھا اور آخر وہیں کی خاک سے پیوند ہوئے۔

۲۳؍ جمادی الثانی کو مدرسین اور طلبائے دارالعلوم نے قرآن پاک پڑھ کر مرحوم کی روح کو ہدیہ ثواب بھیجا اور مدرسہ دارالعلوم تین دن کے لئے بند کر دیا گیا۔

(ماہنامہ الندوہ ستمبر ۱۹۰۷ء ص ۱)

تعلیقات وحواشی:

(۱) خان بہادر منشی اطہر علی کاکوروی [۱۸۴۷ - ۱۹۰۷ء] وکیل، رئیس کاکوری ومشیر انجمن تعلقہ داران اودھ، آنریری مجسٹریٹ لکھنؤ۔ حکومت سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ تحریک ندوہ کے ابتدائی سرگرم اشخاص میں سے تھے۔ ندوہ کا دوسرا اجلاس انہی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، جس کے تمام مصارف بھی انہی نے برداشت کئے تھے۔ علامہ شبلی کی انھوں نے بڑی مخالفت کی۔ یہاں تک کہ ندوے کے اجلاس میں علامہ کی تقریروں پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا۔ ماہنامہ الندوہ کا علامہ شبلی کو ایڈیٹر بنائے جانے کے بھی مخالف تھے

اور بڑی مشکل سے انھیں راضی کیا گیا۔ (مکتوبات شبلی ص ۱۲۱) لیکن خود ان کی مخالفت ان کے ایک حریف [سندیلہ کے چودھری] نے حکومت سے شکایت کرکے کی، جس کے نتیجہ میں انھیں برطانوی ہند کو خیر باد کہنا پڑا اور وہ پہلے حیدرآباد، پھر وہاں سے مدینہ منورہ ہجرت کر گئے۔ ۱۹۰۷ء میں وہیں وفات پائی۔ علامہ شبلی کی عالی ظرفی دیکھئے اشارے اور کنائے سے بھی اختلاف ظاہر نہیں کیا ہے۔

[۱۴]

نواب عبدالشکور خاں (۱)

نہایت افسوس ہے کہ نواب عبدالشکور خاں رئیس علی گڑھ نے حج سے واپس آتے ہوئے راستہ میں وفات پائی۔ مرحوم اول شخص ہیں جنھوں نے ندوہ کو مالی امداد دی۔ مرحوم کو قومی کاموں سے ایک فطری دلچسپی تھی۔ طلبائے دارالعلوم نے ۷ر رجب کو ایک جلسہ تعزیت منعقد کیا، جس میں سید سلیمان (۲) نے ایک عربی مرثیہ (۳) پڑھا۔ ہم نہایت خلوص کے ساتھ دعا کرتے ہیں کہ خدا مرحوم کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(ماہنامہ الندوہ ستمبر ۱۹۰۷ء ص ۲)

تعلیقات وحواشی:

(۱) پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالشکور خاں شروانی اعلی درجے کے منتظم، نہایت فیاض اور بہت دین دار شخص تھے۔ باز خوانی شروانیوں میں علم دین انھوں ہی نے سب سے پہلے حاصل کیا تھا اور پھر انھوں ہی نے اسے اپنے بعد کی نسلوں کو منتقل کیا۔ فقہ کی مشہور کتاب درمختار ان کی میز پر رکھی رہتی تھی، جب کسی مسئلے کی تفتیش مقصود ہوتی تو کسی عالم کو بلا کر کہتے کہ اس میں مسئلہ نکال کر دکھائے۔ ان کے دور میں بھیکم پور علماء وفضلاء کا مرکز تھا۔ خود بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ پیوند لگا ہوا کپڑا بھی پہن لیتے تھے لیکن سخاوت کا یہ عالم تھا کہ جب ۱۹۰۷ء میں سفر حج کے دوران واپس آتے ہوئے جدہ میں ۷۷ر برس کی عمر میں وفات پائی تو جائداد پر کثیر قرض چھوڑا تھا۔ سرسید کے تعلیمی مشن کے حامی

تھے، لیکن ان کے مذہبی عقائد سے اس حد تک اختلاف رکھتے تھے کہ اپنے بھتیجے (مولوی) حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے ایم اے او کالج میں نہیں، آگرہ کالج میں داخل کرایا تھا۔ باقاعدہ انگریزی حصول تعلیم کی اس خاندان میں یہ پہلی مثال تھی۔ ایم. اے. او. کالج کے ٹرسٹی تھے۔ ان کے نام کا پتھر اسٹریچی ہال میں نصب ہے۔ وہ ٹرسٹی بل کے مخالفین میں سے تھے۔ سنا ہے کہ اختلاف رائے کے باوجود سر سید ان کی بات بہت توجہ سے سنتے تھے اور ان کا بہت احترام کرتے تھے۔''

(دھوپ چھاؤں ص ۲۳)

(۲) علامہ سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] جانشین شبلی اور معمار دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۳) سید صاحب کا یہ مرثیہ دستیاب نہ ہوسکا۔

[۱۵]

احمد رضا خاں سکندر نواز جنگ (۱)

کس قدر افسوس کے ساتھ یہ خبر سننے کے قابل ہے کہ حافظ احمد رضا خاں سکندر نواز جنگ سابق مدار المہام ریاست بھوپال ورکن عدالت العالیہ نظام نے ماہ جمادی الثانی ۱۳۲۵ھ میں وفات پائی۔ مرحوم نے ابھی ابھی ندوہ کے کتب خانہ میں ۶۰۰/کتابیں وقف کی تھیں۔ ندوہ کی مالی امداد کا بھی ارادہ رکھتے تھے۔ مگر افسوس بدقسمتی سے پورا نہ ہوا۔

(ماہنامہ الندوہ، ستمبر ۱۹۰۷ء ص۲)

تعلیقات وحواشی:

(۱) جیسا کہ علامہ شبلی کے وفیاتی نوٹ سے واضح ہے احمد رضا خاں سکندر نواز جنگ ریاست بھوپال میں مدار المہام کے عہدہ پر فائز رہے اور نظام حیدرآباد کی عدالت کے رکن بھی، انھوں نے غالباً اگست یا ستمبر ۱۹۰۷ء میں وفات پائی۔ ان کے سوانح اور حالات دستیاب نہ ہو سکے۔

[۱۶]

نواب محسن الملک (۱)

آج ہماری قدیم تعلیم وتربیت کی ایک اور یادگار مٹ گئی۔ جدید تعلیم ایک مدت سے جاری ہے اور آج سینکڑوں ہزاروں تعلیم یافتہ بڑے بڑے خدمات پر ممتاز ہیں، لیکن قومی علم ابھی تک ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے، جنھوں نے کالجوں کے ایوانوں میں نہیں، بلکہ مکتب کی چٹائیوں پر تعلیم پائی تھی۔ جدید تعلیم بھی ان ہی کی بدولت پھیلی اور آج خود جدید تعلیم یافتہ گروہ ان ہی کے اشاروں پر حرکت کر رہا ہے۔

لوگوں کو ڈر تھا کہ سرسید مرحوم کے بعد ان کے منصوبوں کو کون انجام دے گا؟ لیکن خدا نے ان ہی کے ہم نشینوں میں سے ایک ایسا شخص (نواب محسن الملک) پیدا کر دیا جو اور امور میں گو سرسید کا ہمسر نہ تھا، لیکن کالج کی ترقی، وسعت اور مقبول عام بنانے میں سرسید سے کسی طرح کم رتبہ نہ تھا۔ اس نے تھوڑی مدت میں سات آٹھ لاکھ روپیہ جمع کر دیا۔ کالج کی ہر شاخ اس قدر ترقی کر گئی کہ اگر کوئی شخص جس نے سرسید مرحوم کی زندگی میں کالج کو دیکھا تھا آج جا کر دیکھے تو کالج کو پہچاننا مشکل ہوگا۔ کانفرنس جو روز بروز پژمردہ ہوتی جاتی تھی، نواب محسن الملک مرحوم نے اس کو دوبارہ زندہ کیا اور لاہور سے ڈھاکہ تک اس کے ڈانڈے ملا دیئے۔

مرحوم ذاتی صفات کے لحاظ سے بھی نادرہ روزگار تھے۔ اس درجہ، اس عزت، اس رتبہ پر ان کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ ادنی درجہ کے آدمیوں سے بہ ادب وعزت ملتے تھے۔ ملاقات میں ہمیشہ پیش قدمی کرتے تھے۔ سب سے جھک کر ملتے تھے۔ اس کے ساتھ

نہایت فراخ حوصلہ، فیاض، سخی اور جواد تھے اور یہی اوصاف تھے، جن کی وجہ سے انھوں نے عالم کو مسخر کر لیا تھا۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی وہ مشاہیر کے ہم سر تھے۔ ان کا ایک خاص لٹریچر تھا جو ان ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔ قوت تقریر میں بھی وہ نہایت ممتاز تھے۔

ظاہری صورت و شان سے بھی خدا نے ان کو کافی حصہ دیا تھا۔ ان کے چہرے سے شان ٹپکتی تھی اور گو وہ سید تھے، لیکن تاتاری استخواں کا دھوکا ہوتا تھا۔

اخیر عمر میں ان کو کالج کے لڑکوں کی شورش کا بہت صدمہ ہوا۔ کہتے تھے کہ میں اس رنج سے گھلا جاتا ہوں اور واقع میں میں نے ان کو جب شملہ جاتے ہوئے دیکھا تو ان کی صورت دیکھ کر گھبرا گیا کہ اب یہ آفتاب لب بام آ پہنچا۔

محسن الملک! جا اور خوش خوش خدا کے سایہ رحمت میں آرام کر۔ تو درد بھرا دل رکھتا تھا۔ لوگ بھی تیرے لئے روئیں گے اور بہت روئیں گے۔

در روزگا عشق تو، ما ہم فدا شدیم
افسوس کز قبیلہ مجنوں کسے نماند

(مقالات شبلی ج ۸ ص ۱۹۳۔۱۹۴)

تعلیقات و حواشی:

(۱) مولوی مہدی علی خاں نواب محسن الملک [۱۸۳۷۔۱۹۰۷ء] علی گڑھ تحریک کے کاروان اول کے رکن اور سرسید کے جانشین تھے۔ علامہ شبلی کے خاص دوست اور بے حد مداح تھے۔ جنوری ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملا تو انھوں نے کہا کہ:

''میرے نزدیک صرف وہ چند صفحے جو میرے معزز دوست نے جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ پر لکھے ہیں، ایسے ہیں کہ اگر کوئی کام مسلمانوں کے

فائدہ کا انھوں نے نہ کیا ہوتا اور سوائے ان کے کوئی دوسری تحریر ان کی نہ ہوتی
تو وہی چند صفحے ان کی فضیلت، لیاقت اور علم پر شاہد اور مسلمانوں کے فخر اور
عزت کے لئے کافی اور ان کے شمس العلماء ہونے کے شاہد تھے۔

(حیات شبلی ص ۲۷۲)

یہ ان کی مفصل تقریر کا ایک ٹکڑا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس خطبہ کے ایک ایک لفظ سے دونوں کے گہرے مراسم اور محبت آمیز تعلقات ظاہر ہوتے ہیں۔ سرسید کی وفات کے بعد جب علی گڑھ کی زمام کار نواب صاحب کے ہاتھوں میں آئی تو انھوں نے متعدد بار کوشش کی کہ علامہ شبلی علی گڑھ واپس آجائیں۔ انگریزی حکومت کو علامہ شبلی سے جو بدگمانی تھی اس کو نواب صاحب نے اسی لئے رفع کیا کہ انھیں علی گڑھ بلایا جا سکے، مگر علامہ شبلی نے ندوہ کے آگے ان کی ایک نہ سنی۔

علامہ شبلی علی گڑھ سے مستعفی ہونے کے بعد اعظم گڑھ آئے اور سخت علیل ہوئے تو ان کی عیادت کے لئے اعظم گڑھ آئے اور شبلی منزل میں تین دن قیام کیا۔ یہ شاید نواب محسن الملک کا اعظم گڑھ کا پہلا اور آخری سفر تھا۔ ۱۹۰۵ء میں نواب محسن الملک نے علامہ شبلی کو کالج کی سینٹرل کمیٹی کا رکن نامزد کیا، جسے مولانا نے منظور فرما لیا۔ غرض دونوں میں بڑے گہرے تعلقات آخر تک رہے۔ علامہ شبلی کے وفیاتی نوٹ سے بھی تعلق کی وضاحت ہوتی ہے۔

نواب صاحب نے کئی کتابیں سپرد قلم کیں۔ آیات بینات (چار حصے)، اسلام فطرت اور قانون فطرت، اشاعت اسلام، مضامین مہدی وغیرہ ان کے متعدد لکچر بھی کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔

---

[۱۷]

صفیہ جہاں بیگم(۱)

نہایت افسوس ہے کہ جناب صفیہ جہاں بیگم بنت نواب والا جاہ امیر الملک سید صدیق حسن خاں مرحوم نے گذشتہ ماہ کان پور میں انتقال کیا۔ دعا ہے کہ خدا مرحومہ کے فرزند نواب سید مرتضی صاحب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نواب سید مرتضی صاحب نے اپنی والدہ مرحومہ کی یادگار میں ان کا کتب خانہ جو ان کو نواب صدیق حسن خاں بہادر سے ترکہ میں ملا تھا، ندوہ کو دیدیا ہے۔ ان کے نام سے دارالعلوم کی عمارت میں وہ ایک کمرہ بھی تعمیر کرانے والے ہیں۔

(ماہنامہ الندوہ، اکتوبر ۱۹۰۸ء ص ۱۔۲)

تعلیقات وحواشی:

(۱) صفیہ جہاں بیگم: نواب سید علی حسن خاں [۱۸۶۶۔۱۹۳۰ء] کی ہمشیرہ تھیں۔ ۲۳ر ستمبر ۱۹۰۸ء کو کان پور میں انتقال کیا۔ انھیں نواب سید صدیق حسن خاں [۱۸۲۳۔۱۸۹۰ء] کی جو کتابیں ورثہ میں ملی تھیں انھوں نے دار العلوم ندوہ کو دے دیا تھا۔ مزید حالات دستیاب نہ ہو سکے۔

[۱۸]

والد مولانا سید عبدالحی حسنی (۱)

سخت افسوس ہے کہ مولوی عبدالحی صاحب (۲) کے والد مرحوم نے انتقال کیا۔ مولوی صاحب موصوف کے جو احسانات ندوہ پر ہیں اس کے لحاظ سے اور نیز ذاتی تعلقات کی بنا پر ہم نہایت تہِ دل سے مولوی صاحب کے ساتھ اس واقعہ میں ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون .

(ماہنامہ الندوہ نومبر ۱۹۰۸ء ص۲)

تعلیقات وحواشی:

(۱) مولانا سید عبدالحی حسنی [۱۸۶۹-۱۹۲۳ء] کے والد مولوی حکیم سید فخر الدین [۱۸۴۰-۱۹۰۸ء] اردو اور عربی و فارسی کے عالم و ادیب اور شاعر تھے۔ متعدد کتابیں لکھیں، مگر چند ہی شائع ہوسکیں۔ زیادہ حصہ تلف ہوگیا۔ عرصہ تک درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [۱۹۱۳-۱۹۹۹ء] باطنی کمالات سے بھی مالا مال تھے۔ (حیات عبدالحی ص۲۱) یہی کتاب تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ ۶/ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو انتقال کیا اور اپنے آبائی قبرستان دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں مدفون ہوئے۔

(۲) مولانا سید عبدالحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد گرامی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حیات عبدالحی، مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔

[۱۹]

والدہ عطیہ بیگم فیضی (۱)

نمی بینم حدیث نامہ چون است
ہمیں دانم کہ عنوانش بہ خون است

جوسخت حادثہ پیش آیا اس کے متعلق کیا کوئی لکھ سکتا اور کیا کہہ سکتا ہے۔ آپ لوگوں کی دین ودنیا سب ان ہی سے وابستہ تھی۔ صبر کی تلقین کرنا آسان ہے، لیکن کیا کوئی تلقین کرنے والا خود بھی ایسے موقع پر صبر کرسکتا ہے۔ (۲) آپ تو پھر تجربہ کار اور روزگار دیدہ ہیں۔ عزیزی عطیہ کی حالت پر اور بھی زیادہ رنج ہوتا ہے۔ (۹ر دسمبر ۱۹۰۸)

(خطوط شبلی ص ۹۹)

جو صدمہ آپ کو ہوا میں خوب اس کا اندازہ کرسکتا ہوں۔ ان شاء اللہ تعزیت کے لئے بہت جلد میں خود حاضر ہوں گا''۔ (۲۱ر دسمبر ۱۹۰۸ء)

(خطوط شبلی ص ۴۶)

قطعہ تاریخ وفات

(۲۷ر فروری ۱۹۰۹ء)

بود بست وششم وسیزدہ صد از ہجرت | کہ بزد نقشِ دگر بخت ستم گارۂ ما
مہرباں مادرِ ما، سایہ زما (۳) باز گرفت | آں ہمایوں نفس، آں مونس وغم خوارۂ ما
آں کہ بازیگۂ ما (۴) بود کنار ودوشش | آنکہ کرد از رگِ جاں رشتۂ گہوارۂ ما
آہ ازاں مہر ومحبت کہ (۵) بدش می ناید | گر کسے گفت فلاں ہست پرستارۂ ما

خانۂ دولت ما تیرہ تر از شب گشتہ است تا برفت آں ششم وسبعۂ سیارہ ما
مادرا! تا بچہ حالی؟ کہ نداری خبرے زانچہ بگذشت بہ ماو دل صد پارۂ ما
خود ہماں غازۂ رنگیں کہ بہ رویم بستی حالیا گردِ یتیمی است بہ رخسارۂ ما
اختر ومہر ومہ وچرخ ہمہ درکار اند لیک کس می نتواند کہ کند چارۂ ما
دہر ہر چند کہ آراستہ بزمی است ولی بے تو با ہیچ نہ سازد دل آوارۂ ما
تا بہ بینی کہ فراق تو چہا کرد؟ بہ ما گاہے از خلد بروں آئے بہ نظارۂ ما
بہر ما مرگ پدر مرگ نخستین بودہ است چوں روا داشتی ایں مرگ دگر بارۂ ما
شبلی ایں مرثیہ گفتم ز زبانِ زہراء آں کہ صد لطف عیاں داشتہ در بارۂ ما

(کلیات شبلی فارسی ص۷۶)

تعلیقات وحواشی:

(۱) عطیہ فیضی [۱۸۷۷-۱۹۶۷ء] وزہرا بیگم [۱۸۶۶-۱۹۴۰ء] کی والدہ اور حسن علی آفندی کی اہلیہ امیر النساء بیگم امیرا [۱۸۴۹-۱۹۰۸ء] بڑی ذی علم خاتون تھیں۔ اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور مراٹھی زبانوں سے واقف تھیں۔ نثر ونظم دونوں پر قادر تھیں۔ ان کے کلام کے دو مجموعے ''یادگار امیرا'' اور ''آمین'' ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئے۔ ان کے ایک ناول ''نادر بیان'' کا بھی ذکر ملتا ہے۔

امیر النساء بیگم بدر الدین طبیب جی [۱۸۴۴-۱۹۰۶ء] کے برادر کلاں شجاع الدین کی بڑی بیٹی تھیں۔ ان کی شادی فیضی خاندان کے ایک متمول شخص حسن علی آفندی [۱۸۳۸-۱۹۰۳ء] سے ہوئی تھی، جن کی تجارت قسطنطنیہ ترکی میں تھی۔ ایک عرصہ تک امیر النساء بیگم کا قیام ترکی میں رہا۔ ان کی بچیوں زہرا، نازلی اور عطیہ وغیرہ کی پیدائش وہیں کی تھی۔ اس لئے ترکی زبان سے بھی بخوبی واقف ہوگئی تھیں۔

(۲) علامہ شبلی کو اپنی والدہ سے بے حد شیفتگی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی یادگار کے طور پر ایک عمارت صدر المنازل کے نام سے تعمیر کرائی جو آج بھی موجود ہے۔ وہ جب کسی کی والدہ کے انتقال کی خبر سنتے نمناک ہو جاتے۔ ان کے متعدد خطوط میں اس طرح کی تحریریں شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں بھی بعض تحریریں شامل ہیں۔

(۳) سایہ اٹھا لینا (شبلی)

(۴) ہمارا ریان گاہ تھا۔ (شبلی)

(۵) برا نہیں لگتا تھا۔ (شبلی)

[۲۰]

مولانا فاروق چریاکوٹی

ایک اور آفتاب علم غروب ہوگیا

ہندوستان میں قدیم تعلیم کی یادگاریں اس قدر کم رہ گئی ہیں کہ گویا کچھ نہیں رہیں، تاہم اس وقت تک ہندوستان کے علمی افق میں جو روشنی ہے، اسی تعلیم کی ہے۔ فقہ، اصول، حدیث، تفسیر، ادب، کلام کا کوئی مشکل مسئلہ آج دریافت کرنا ہو تو نئی نسلیں بالکل بے کار ثابت ہوں گی۔ اس بنا پر جب اس قدیم عمارت کا کوئی ستون گرتا ہے تو دل کانپ جاتا ہے کہ اب کیا ہوگا۔

اساتذہ قدیم میں سے صرف دو شخص باقی رہ گئے تھے۔ مولانا لطف اللہ صاحب (۱) اور مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی اور افسوس کہ ان دو میں سے بھی ایک نے اپنی جگہ خالی کردی، یعنی مولانا فاروق صاحب نے ۲۸/اکتوبر ۱۹۰۹ء کو انتقال کیا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون** (۲)۔

مولانا موصوف چریاکوٹ کے رہنے والے تھے۔ جو اعظم گڑھ کے ضلع میں ایک مردم خیز قصبہ ہے۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی مولوی عنایت رسول صاحب (۳) اور مولانا محمد یوسف صاحب فرنگی محلی (۴) اور مولوی نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی (۵) سے تمام علوم کی تکمیل کی تھی۔ علم ادب اگرچہ بطور خود حاصل کیا تھا، تاہم بہت بڑے ادیب اور ناظم و ناثر تھے۔

مزاج میں سخت وارستگی، بے پروائی اور بے تکلفی تھی۔ اس لئے ایک جگہ قیام نہیں

کر سکتے تھے۔ نہ کوئی کام با قاعدہ انجام دے سکتے تھے۔ اسی وجہ سے کوئی بڑی خدمت یا عہدہ نہ حاصل کر سکے۔ نہ ان کو اس کی پروا تھی۔ علمی ذوق اس قدر غالب تھا کہ سخت سے سخت دنیاوی کشمکشوں میں بھی تعلم و تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ بے قاعدگی کی وجہ سے کوئی مستقل تصنیف نہیں کی۔ چھوٹے چھوٹے دو چار رسالے لکھے اور وہ بھی ناتمام رہ گئے۔ تمام مسائل علمیہ میں مجتہدانہ رائے رکھتے تھے اور جب کوئی کتاب پڑھتے تھے تو عموماً مصنف کی غلطیوں اور فروگذاشتوں سے تعرض کرتے تھے۔

میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاہد، ملا جلال مع میر زاہد، حمد اللہ، شرح مطالع، صدرا، شمس بازغہ ان ہی سے پڑھیں اور میری تمام تر کائنات ان ہی کے افادات ہیں۔ فارسی کا مذاق بھی ان ہی کا فیض ہے۔ اکثر اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے۔

چوں کہ ان کی کوئی علمی تصنیف شائع نہیں ہوئی، اس لئے ہم چند اشعار درج کرتے ہیں کہ مشتے نمونہ از خروارے۔

رسیدی در بودی دین و دل در جنبش چشمے — بہ یک گردش چو جام بادہ کارم ساختی رفتی
بہ گلشن آمدی و غنچہ را در خوں جگر کردی — نسیم آسا سمند ناز برگل تاختی رفتی

نہ دارد دل دگر تاب طپیدن — نگاہ خویش را رحم آشنا کن
نہ دارد چشم من تاب جمالت — بیا چوں مردمک در دیدہ جا کن

زمانہ گر ز خط حکم تو بہ پیچد سر — دو رشتہ شب و روزش بہ تن شود زنار

(ماہنامہ الندوہ لکھنؤ اکتوبر ۱۹۰۹ء ص ۱-۲)

تعلیقات وحواشی:

(۱) استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی [۱۸۲۸ء-۱۹۱۴ء] استاذ مدرسہ جامع مسجد علی گڑھ ان سے علی گڑھ، فیض عام کان پور اور حیدر آباد میں بے شمار لوگوں نے تحصیل علم کیا۔

(۲) مولانا محمد فاروق عباسی چریا کوٹی چریا کوٹ میں پیدا ہوئے اور ۲۸؍اکتوبر ۱۹۰۹ء کو غازی پور میں وفات پائی۔ ان کا مزار شہر غازی پور سے متصل موضع دھاوا شریف میں ابواسحاق محدث لہراوی کے پائیں ایک کھلے احاطہ میں ہے۔ (علامہ محمد فاروق چریا کوٹی اور ان کے تین عظیم بیٹے ص ۶۸، مولانا محمد افروز قادری، چریا کوٹ، ۲۰۱۶ء)

(۳) صاحب بشری، مولانا عنایت رسول چریا کوٹی، مولانا فاروق چریا کوٹی [م: جنوری ۱۹۰۳ء] کے برادر اکبر جن سے انھوں نے علوم معقولات ومنقولات کا درس لیا۔ ۱۸۲۸ء میں چریا کوٹ میں پیدا ہوئے۔ اپنے عہد کے اجلہ روزگار علماء سے تحصیل علم کیا۔ کلکتہ جا کر یہودیوں سے عبرانی پڑھی اور توراۃ وانجیل وزبور اور دوسرے صحف بنی اسرائیل پر عبور پایا اور بشری جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھی۔ جنوری ۱۹۰۳ء میں وفات پائی۔ ان کا مزار چریا کوٹ میں واقع ہے۔ (ایضاً)

(۴) مولانا محمد یوسف فرنگی محلی مدرسہ اسلامیہ امام بخش جون پور کے مدرس تھے۔ ان سے بڑے بڑے علماء نے کسب فیض کیا۔ ان کے زمانہ مدرسی میں مدرسہ امام بخش کو بڑی مرجعیت نصیب ہوئی۔ مولانا فاروق چریا کوٹی نے یہیں ان سے درس لیا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ علامہ شبلی نے بھی اس مدرسہ میں چندروز پڑھا تھا۔ (حیات شبلی ص ۱۱۱-۱۱۲)

(۵) مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی کا شمار ہندوستان کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔

[۲۱]

محمد حسین آزاد(۱)

افسوس ہے کہ اردو کے عناصر اربعہ (سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی) میں سے ایک اور عنصر کم ہوگیا۔ یعنی محمد حسین صاحب آزاد نے ۸۲؍ برس کی عمر میں وفات پائی۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے انگریزی انشا پردازی سے اس طرح اردو میں کام لیا کہ بظاہر ایشیائی انشا پردازی معلوم ہوتی ہے اور دھوکا ہوتا ہے کہ ظہوری اور ظہیری کے استعارات و تشبیہات اردو میں آ گئے ہیں۔ حقیقت میں وہ طرز خاص کے موجد وخاتم تھے۔ چونکہ ہمارے عزیز مولوی عبد السلام (۲) اسسٹنٹ ایڈیٹر الندوہ ان کی انشاپردازی پر مستقل مضمون لکھنے والے ہیں، اس لئے ہم زیادہ نہیں لکھتے۔ دار العلوم ندوہ ان کے ماتم میں ایک دن کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔

(ماہنامہ الندوہ، مارچ ۱۹۱۰ء ص ۵)

تعلیقات وحواشی:

(۱) مولوی محمد حسین آزاد [۱۸۳۰۔۱۹۱۰ء] کی مشہور کتابیں آب حیات، سخندان پارس اور دربار اکبری اردو ادب کا زیور ہیں۔ انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور بحیثیت انشا پرداز ان کا درجہ سب سے بلند ہے۔ علامہ شبلی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔ ان سے علامہ شبلی کی خط وکتابت بھی تھی۔

(۲) شاگرد شبلی مولانا عبد السلام ندوی [۱۸۸۳۔۱۹۵٦ء] صاحب شعر الہند، تفصیل کے لئے دیکھیں راقم کی کتاب ''یگانۂ روزگار مولانا عبد السلام ندوی''، ادبی دائرہ اعظم گڑھ۔

[۲۲]

ملک معظم کی وفات (۱)

تمام دنیا میں ملک کی بدقسمتی کا اندازہ مختلف مصیبتوں سے کیا جاتا ہے، لیکن ان تمام مصائب میں بادشاہ کی موت ایک ایسی عالم گیر مصیبت ہے جس کا اثر عالم، جاہل، امیر، غریب، تعلیم یافتہ، غیر تعلیم یافتہ غرض سب پر یکساں پڑتا ہے۔ بالخصوص ایشیائی قومیں اس مصیبت سے خاص طور پر متاثر ہوتی ہیں۔ اس بنا پر حضور ملک معظم کی مرگ مفاجات پر ہندوستان میں جو ماتم کیا جارہا ہے، وہ ہندوستان کا عام قومی شعار ہے، لیکن اعلیٰ حضرت ملک معظم کے زمانے میں ہندوستان نے جس قدر ترقی کی ہے اور ان کی حسن تدبیر اور طرز عمل نے آئندہ کے لئے جو خوشگوار امیدیں پیدا کردی تھیں، اس نے اس مصیبت کے اثر کو اور بھی نمایاں کردیا ہے۔ اعلیٰ حضرت ہی کے زمانے میں ملکہ معظّمہ کے اعلان کی تجدید ہوئی۔ ریفارم اسکیم کا اعلان کیا گیا۔ ہندوستانیوں کو بعض ایسے اعلیٰ عہدے دیئے گئے جو ان کی توقعات سے بالاتر تھے۔

اعلیٰ حضرت کے زمانے میں مذہبی گروہ نے بھی اس مذہبی آزادی اور بے تعصبی سے پورا فائدہ اٹھایا جو برٹش سلطنت کا لازمی خاصہ ہے، اس بنا پر ہندوستان میں عام طور پر اعلیٰ حضرت کا ماتم کیا گیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی جو ایک مذہبی درسگاہ ہے اس صدمۂ جانکاہ میں دو روز کے لئے بند کردیا گیا اور نواب لفٹنٹ گورنر اور حضور ویسرائے کی خدمت میں تعزیت کے تار دیئے گئے۔

۲۰/مئی ۱۹۱۰ء کو جس روز **ملک معظم** کا جنازہ اٹھنے والا تھا دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک ماتمی جلسہ کیا گیا۔ جلسہ میں تقریباً شہر کے ارکان موجود تھے۔ چونکہ جمعہ کو معمولی تعطیل تھی اس لئے اس کے بجائے شنبہ کو مدرسہ ایک روز کے لئے بند کر دیا گیا۔

(ماہنامہ الندوہ مئی ۱۹۱۱۰ء ص ب)

تعلیقات وحواشی:

(۱) **ملک معظم:** البرٹ ایڈورڈ معروف ایڈورڈ ہفتم، ملکہ وکٹوریہ کا بیٹا۔ ۹/نومبر ۱۸۴۱ء کو برطانیہ میں پیدا ہوا۔ ۲۳/جنوری ۱۹۰۱ء کو تاج پوشی ہوئی۔ ۶/مئی ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا۔ وفات یعنی ۶/مئی ۱۹۱۰ء تک برطانیہ اور اس کے مقبوضات کا حکمراں رہا۔

[۲۳]

منشی ذکاء اللہ دہلوی (۱)

نہایت افسوس ہے کہ شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب [۱۸۳۲-۱۹۱۰ء] نے انتقال فرمایا۔ مولوی صاحب موصوف ایشیائی تہذیب اور شائستگی کی بہترین مثال تھے۔ پابندی اوقات کا یہ حال تھا کہ جو معمول آغاز عمر سے قائم ہوا اخیر زندگی تک قائم رہا۔ نہایت زندہ دل، ہنس مکھ، دوست پرور اور صاحب ذوق تھے۔ خدا مغفرت کرے اور ان کے پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے۔

(ماہنامہ الندوہ نومبر ۱۹۱۰ء ص ۳۱)

تعلیقات وحواشی:

(۱) خان بہادر شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی ہندوستان کے مایہ ناز مورخ ومصنف تھے۔ ان کے قلم سے تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں نکلیں۔ اس میں تاریخ ہندوستان جو دس جلدوں پر مشتمل ہے ان کا براعظیم الشان کارنامہ ہے۔ وہ یکم اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ قدیم دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ عربی، فارسی اور ریاضی میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ اولاً قدیم دہلی کالج میں ریاضی کے استاذ مقرر ہوئے۔ بعد ازاں میور کالج الہ آباد میں عربی وفارسی کے پروفیسر ہوئے۔ اپنی گراں قدر خدمات کے صلہ میں خان بہادر اور شمس العلماء کے خطاب سے نوازے گئے۔ ۷/نومبر ۱۹۱۰ء کو دہلی میں ۷۸/برس کی عمر میں وفات پائی۔

[۲۴]

مولانا مسیح الزماں خاں (۱)

افسوس ہے کہ جناب مولانا مسیح الزماں خاں صاحب استاذ حضور نظام دکن نے بعارضہ فالج اپنے وطن شاہ جہاں پور میں انتقال فرمایا۔ مولانائے موصوف ایک مدت تک ندوۃ العلماء کے ناظم رہے۔ نظامت سے مستعفی ہونے کے بعد بھی وہ بحیثیت رکن ندوۃ العلما کی خدمت میں سرگرمی کے ساتھ مصروف رہے۔ چنانچہ وہ اکثر جلسہ ہائے انتظامیہ میں شریک ہوکر ارکان انتظامیہ کو اپنے مفید مشوروں سے مدد دیتے تھے۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند تعالی مرحوم کی مغفرت کرے اور ان کے پس ماندوں کو صبر عطا فرمائے۔

(ماہنامہ الندوہ، جنوری ۱۹۱۱ء ص۲)

تعلیقات وحواشی:

(۱) میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد کے اتالیق مولانا مسیح الزماں خاں بڑے پایہ کے عالم تھے۔ ۱۸۴۰ء میں اپنے وطن شاہ جہاں پور اتر پردیش میں پیدا ہوئے اور ۱۷ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو اپنے وطن ہی میں وفات پائی۔ تفصیل کے لئے دیکھیں ''حیات مسیح'' از مظفر حسین سلیمانی، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۹۱۱ء۔

[۴۵]

حضور نظام علیہ الرحمہ (۱)

غریباں را دل از بہر تو خون است
دل خویشاں نمی دانم کہ چون است

یہ جاں کاہ واقعہ ہماری زندگی کا سب سے اندوہ ناک اور قیامت انگیز واقعہ ہے۔
حضور نظام تیموریوں کی شان وشوکت، دریا دلی وفیاضی، عفو و بردباری، عزم واستقلال کے مجسم تصویر پیکر تھے۔ تیموریوں کے بہت سے آداب وآئین جو ہم تاریخوں میں پڑھتے ہیں اور جن کی صحیح تصویر ہمارے ذہن میں نہیں آتی، حضور نظام کے آداب سلطنت اور نظام حکومت سے صاف سمجھ میں آجاتے تھے۔ حلم وعفو کا یہ حال تھا کہ جو لوگ بوجوہ خاص معتوب ہوتے اور الگ کئے جاتے تھے، ان کے بھی بیش قرار وظائف مقرر ہو جاتے تھے۔ تمام عمر میں ایک شخص کی بھی روزی بند نہیں کی۔ ہندوستان میں جس قدر اسلامی درسگاہیں ہیں سب ان کے دست کرم کی ممنون ہیں۔ ملک میں جس قدر مشاہیر ارباب تصنیف ہیں سب انھیں کے خوان فیض سے بہرہ یاب ہیں۔ شہسواری، نشانہ بازی، قدر اندازی، سپہ گری میں ان کا جواب نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج وہی ایک ذات والا صفات تھی جو ارباب فن کا مربی، علم و فضل کا پشت پناہ، مصنّفین کا کعبۂ آرزو، مظلوموں کا دادرس اور رعایا کا پدر مہربان تھا۔
اکبر کی بے تعصبی، جہاں گیر کی رنگین مزاجی، شاہ جہاں کی شوکت، عالم گیر کے

استقلال نے مل کر ایک قالب اختیار کر لیا تھا۔

نہ صرف حیدر آباد بلکہ تمام ہندوستان اس ماتم میں شریک ہے اور سب اس ذات گرامی کے لئے دست بدعا ہیں کہ

جایش بہ سایہ حرم کردگار باد

(ماہنامہ الندوہ ستمبر ۱۹۱۱ء ص ۱)

تعلیقات وحواشی:

(۱) میر محبوب علی خاں نظام الملک آصف جاہ فرماں روائے حیدر آباد [م: ۲۹/اگست ۱۹۱۱ء] سے علامہ شبلی کی پہلی ملاقات سر سید احمد خاں کے ساتھ ہوئی تھی۔ ۱۸۹۶ء میں انھوں نے از راہ قدر دانی علامہ شبلی کا سو روپیہ ماہوار وظیفہ اس شرط کے ساتھ مقرر کیا کہ آئندہ ان کی تمام تصنیفات سلسلہ آصفیہ میں شامل ہوں گی۔ چنانچہ علامہ شبلی کی متعدد تصنیفات سلسلہ آصفیہ میں داخل ہوئیں اور وہیں سے شائع بھی ہوئیں۔ الفاروق اور الغزالی سلسلہ آصفیہ ہی کی یادگار ہیں۔

[۲۶]

محمد اسحاق وکیل (۱)

میرا سب کچھ جاتا رہا۔ انا للہ۔ (۱۰/اگست ۱۹۱۴ء) جو مصیبت مجھ پر پڑی، شاید تمہیں معلوم نہیں۔ عزیز بھائی اسحاق نے جو میرا دست و بازو تھا انتقال کیا۔ میں مدت تک کسی کام کے قابل نہیں رہا۔ (۱۴/اگست ۱۹۱۴ء)

جو مصیبت مجھ پر پڑی اس نے بہت دنوں تک بیکار کر دیا۔

اس پر یہ مصیبت کہ مرحوم کی زوجہ حال نے وفات کے ساتھ ہر قسم کے قانونی اور عدالتی بلکہ فوجداری جھگڑے شروع کر دیئے۔ اب مجھ کو یہاں سے ٹلنا مشکل ہو گیا ہے۔ مقدمات شروع ہو گئے اور ہم ہی دونوں بھائی مدعا علیہم ہیں۔ (۱۸/اگست ۱۹۱۴ء)

واقعہ حال سے اس قدر افسردہ ہو گیا ہوں کہ اب کسی بات سے طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی۔ (۱۶/اکتوبر ۱۹۱۴ء)

میرے خاندان پر جو حادثہ عظیم پیش آیا، اس نے مجھ کو زندہ درگور کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (۸/نومبر ۱۹۱۴ء)

عزیز مرحوم کے واقعہ نے مجھ پر اس قدر سخت اثر کیا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ مہدی مرحوم (۲) کا واقعہ اسی درجہ کا گذر چکا تھا۔ بہر حال میں اعظم گڑھ چلا آیا۔ محمڈن (شبلی) اسکول جو ۳۰/ برس ہوئے میں نے قائم کیا تھا ہائی اسکول سے مڈل تک آ گیا۔ عزیز مرحوم اس کو انٹرنس تک پہنچانا اور تمام برادری کے قصبات میں اسکول اور مکاتب قائم کرنا چاہتے تھے۔ دو مہینہ کا دورہ رکھا تھا اور پانچ سو روپئے مصارف دورہ کے

لئے الگ کر دیئے تھے۔ اشتہارات اور رسید یہاں سب چھپ گئی تھیں۔
(مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۰۰، ص ۱۳۹، ص ۱۱۲، مکاتیب شبلی ج ا ص ۳۱۵)

مرثیہ

بربادی خانمانِ شبلی

وہ برادر کہ مرا یوسف کنعانی تھا   وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیِ انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمت یزدانی تھا   قوت دست و دل شبلی نعمانی تھا
جوش اسی کا تھا جو مرے سر پر شور میں تھا
بل اسی کا یہ مرے خامۂ پر زور میں تھا

ہم سے ناکاروں کی اک قوت عامل تھا وہی   مایۂ عزت اجداد کا حامل تھا وہی
مسند والد مرحوم کے قابل تھا وہی   یوں تو سب اور بھی اعضا ہیں مگر دل تھا وہی
اب وہ مجموعۂ اخلاق کہاں سے لاؤں
ہائے افسوس میں اسحاق کہاں سے لاؤں

جب کیا والد مرحوم نے دنیا سے سفر   گھر کا گھر تھا ہدف ناوک صد گونہ خطر
بن گیا آپ اکیلا وہ ہر آفت میں سپر   تیر جو آئے، گیا آپ وہ ان کی زد پر
خود گرفتار رہا تا کہ میں آزاد رہوں
اس نے غم اس لئے کھائے تھے کہ میں شاد رہوں

اس کا صدقہ تھا کہ ہر طرح سے تھا میں بے غم   گھر کے جھگڑوں سے نہ کچھ فکر نہ کچھ رنج والم
امن وراحت کے جو سامان تھے ہر طرح بہم   میں تھا اور مشغلہ نامہ وقرطاس وقلم
اس کے صدقہ سے تھی میری سخن آرائی بھی
اس کا ممنون تھا میرا گوشہ تنہائی بھی

تازہ تھا دل پہ مرے مہدی مرحوم کا داغ　　　کہ مرا قوت بازو تھا مرا چشم و چراغ
اس کو جنت میں جو خالق نے دیا گنج فراغ　　　میں یہ کہتا تھا کہ اب بھی تر و تازہ ہے یہ باغ
یعنی وہ آئینۂ خوبی اخلاق تو ہے
اٹھ گیا مہدی مرحوم تو اسحاق تو ہے

آج افسوس کہ وہ نیر تاباں بھی گیا　　　میری جمعیت خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
اب وہ شیرازۂ اوراق پریشاں بھی گیا　　　عتبۂ والد مرحوم کا درباں بھی گیا
گلہ خوبیٔ تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

تجھ کو اے خاک لحد آج اجل نے سونپی　　　وہ امانت جو مرے والد مرحوم کی تھی
بس فطرت میں ودیعت تھی نفاست طلبی　　　ناز پروردۂ نعمت تھا بہ ایں سادہ وشی
دیکھنا اڑ کے غبار آئے نہ دامن پہ کہیں
گرد پڑ جائے نہ اس عارض روشن پہ کہیں

اس کے اخلاق کھٹک جاتے ہیں دل میں ہر بار　　　وہ شکر ریز تبسم، وہ متانت وہ وقار
وہ وفا کیشی احباب وہ مردانہ شعار　　　وہ دل آویزی خو، وہ نگہ الفت بار
صحبت رنج بھی اک لطف سے کٹ جاتی تھی
اس کی ابرو پہ شکن آکے پلٹ جاتی تھی

حق نے کی تھی کرم لطف سے اس کی تخمیر　　　خوبی خلق و تواضع میں نہ تھا اس کا نظیر
بات جو کہتا تھا ہوتی تھی وہ پتھر کی لکیر　　　اس کی ذات تھی مجموعۂ اوصاف کثیر
بس کہ خوش طبع تھا وہ صاحب تدبیر بھی تھا
سچ تو یہ ہے کہ وہ نوخیز بھی تھا پیر بھی تھا

اس کو شہرت طلبی سے کبھی کچھ کام نہ تھا　　　وہ گرفتار کمند ہوس خام نہ تھا

اس کی ہر بات میں اک لطف تھا ابرام نہ تھا　　وہ کبھی مدعی رہبری عام نہ تھا
اس کو مطلوب کبھی گرمی بازار نہ تھی
اس کی جو بات تھی کردار تھی گفتار نہ تھی

اس کو معلوم جو تھا وسعت تعلیم کا راز　　اس نے دیکھے تھے جو منزل کے نشیب اور فراز
اس نے یہ کام نئی طرح کیا تھا آغاز　　مگر افسوس کہ تھا راہ میں رخش تگ و تاز
کوششوں کے جو نتیجے تھے اسے مل نہ سکے
ہائے وہ پھول کہ پھولے تھے مگر کھل نہ سکے

آہ بھائی ترے مرنے کے تھے یہ بھی کوئی دن　　وہ ترا اوج شباب اور وہ بچے کمسن
مسند حلقۂ احباب ہے سونی تجھ بن　　تو ہی تھا اب خلف صدر نشینان مسن
دن جب آئے کہ تجھے رہبر جمہور کہوں
چرخ اب مجھ سے یہ کہتا ہے کہ مغفور کہوں

یہ بھی اے جان براور کوئی جانے کا ہے طور　　اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور　　کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور
چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

آہ! اے مرگ کسی شے کی نہیں تجھ کو تمیز　　تیری نظروں میں برابر ہے گہر اور پشیز
میں نے مانا ترے نزدیک نہ تھا وہ کوئی چیز　　رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اس نے عزیز
لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

اے خدا شبلی دل خستہ بایں موئے سفید　　لے کے آیا ہے تری درگہ عالی میں امید
مرنے والوں کو نجات ابدی کی ہو نوید　　خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید

لکھوں قصہ غم تاب رقم بھی تو نہیں
اب مرے خامۂ پر زور میں دم بھی تو نہیں
(کلیات شبلی اردو ص ۱۰۹-۱۱۱)

تعلیقات وحواشی:

(۱) مولوی محمد اسحاق بی،اے،ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ الہ آباد۔علامہ شبلی کے منجھلے بھائی تھے۔ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں حاصل کرنے کے بعد ایم.اے.او. کالج علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔تحصیل علم کے بعد الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔جس میں انھوں نے بڑی ترقی کی اورالہٰ آباد ہائی کورٹ کے نامور وکیل قرار پائے۔

وہ علامہ شبلی کے دست راست تھے۔زمین داری کے تمام کام انھیں کے ذمہ تھے بلکہ انھوں نے علامہ شبلی کو فارغ کررکھا تھا۔قومی کاموں میں بڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔علامہ شبلی کے قائم کردہ نیشنل اسکول کے برسوں سکریٹری رہے۔۱۲/اگست ۱۹۱۴ء کو بعارضہ تپ محرقہ یکا یک الہ آباد میں انتقال کیا۔اس سال ان کا یہ منصوبہ تھا کہ اعظم گڑھ کے تمام قصبات میں اسکول قائم کئے جائیں گے۔اس کے لئے انھوں نے پانچ سو کی ایک رقم بھی مختص کرلی تھی۔مگر اللہ کو منظور نہ تھا۔چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد جسٹس اقبال احمد ان کے داماد تھے۔اب ان کے بیٹے اور داماد سب وفات پا چکے ہیں۔البتہ پوتے زندہ ہیں۔اللہ انھیں شاد وآباد رکھے۔

(۲) مہدی حسن بیرسٹر: علامہ شبلی کے بھائی ان کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

اشاریہ

علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں

مرتبہ

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

اشخاص

(ن)

کتب ورسائل

مقامات

کتابیات

۱۔ آثارِ شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء

۲۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۸ء

۳۔ اردو ترجمہ مکاتیب شبلی، ڈاکٹر خالد ندیم، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

۴۔ الندوہ لکھنؤ (جلد ا۔۹) علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،

۵۔ تاریخ بندول، راوت رضی احمد چودھری۔ شبلی لائبریری بندول، ۲۰۱۵ء

۶۔ تذکرہ مشاہیر غازی پور، مولانا عزیز الحسن صدیقی، غازی پور، ۱۹۹۶ء

۷۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری، محمد علی حیدر کاکوروی، اصح المطابع لکھنؤ، ۱۹۲۷ء

۸۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

۹۔ حیات عبدالحی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ندوۃ المصنّفین دہلی، ۱۹۷۰ء

۱۰۔ حیات مسیح، مظفر حسین سلیمانی، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۹۱۱ء

۱۱۔ خطبات شبلی مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء

۱۲۔ خطوط شبلی، منشی امین زبیری، شمسی مشین پریس آگرہ

۱۳۔ دھوپ چھاؤں، پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی، حبیب منزل علی گڑھ، ۲۰۱۱ء

۱۴۔ دیوان ریاض حسن خان خیال، مرتبہ ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی، سیتامڑھی، ۱۹۸۵ء

۱۵۔ سخنوران کاکوری، حکیم نثار احمد علوی، میخانہ ادب کراچی، ۱۹۷۸ء

۱۶۔ شذرات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء

۱۷۔ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، مکتبہ جمال لاہور، ۲۰۱۵ء

۱۸۔ علامہ محمد فاروق چریاکوٹی اور ان کے تین عظیم بیٹے، مولانا محمد افروز قادری، چریاکوٹ، ۲۰۱۶ء

۱۹۔ کلیات شبلی اردو، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء

۲۰۔ کلیات شبلی فارسی مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۵ء

۲۱۔ مآثر صدیقی [۱۔۴] نواب سید علی حسن خاں، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۹۲۴ء

۲۲۔ مقالات شبلی جلد ہفتم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء

۲۳۔ مکاتیب شبلی حصہ اول، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء

۲۴۔ مکاتیب شبلی حصہ دوم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۲۵۔ مکتوبات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء

۲۶۔ یگانۂ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء

مرتب کی چنداور مطبوعات

۱۔ متعلقات شبلی
۲۔ کتابیات شبلی
۳۔ شبلی سخنوروں کی نظر میں
۴۔ مکتوبات شبلی
۵۔ آثار شبلی
۶۔ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط
۷۔ شبلی شناسی کے سو سال
۸۔ شذرات شبلی
۹۔ اقبال اور دبستان شبلی
۱۰۔ شبلی اور جہان شبلی
۱۱۔ مراسلات شبلی
۱۲۔ نوادرات شبلی
۱۳۔ شبلی خودنوشتوں میں
۱۴۔ علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں
۱۵۔ شبلی دیباچوں میں (زیر طبع)
۱۶۔ اسہل التجوید
۱۷۔ تذکرۃ القراء
۱۸۔ علم الترتیل
۱۹۔ علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ
۲۰۔ دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات
۲۱۔ اشاریہ ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ
۲۲۔ عظمت کے نشاں
۲۳۔ ساحلوں کے شہر میں
۲۴۔ شاہ معین الدین احمد ندوی
۲۵۔ مطالعات ومشاہدات
۲۶۔ کتابیں حصہ اول۔دوم
۲۷۔ یگانۂ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی
۲۸۔ عکس واثر
۲۹۔ کتابیات مجیب
۳۰۔ قرائے عظام اور انکی علمی ودینی خدمات
۳۱۔ محبت نامے
۳۲۔ رحمت عالم (ترجمہ: اردو سے ہندی)

تحقیق وتدوین

۳۳۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر
۳۴۔ موازنۂ انیس ودبیر
۳۵۔ کاروان رفتگاں
۳۶۔ متاع رفتگاں
۳۷۔ تاریخ اعظم گڑھ
۳۸۔ اسفار مجیب
۳۹۔ کلیات نشور واحدی حصہ غزلیات

ISBN 938708312-8
9 789387 083127

Price : 180/-